گھاس کا سمندر

سید قاسم محمود

گھاس کا سمندر

ایک ناول ، ایک ڈرامہ

This is an authorized Urdu translation of THE SEA OF GRASS by Conrad Richter.

Published by Alfred A. Knopf, Inc., New York.

(Second edition)

گھاس کا سمندر

تصنیف کونرڈ رکٹر

ترجمہ سید قاسم محمود

شیش محل - لاہور

به اهتمام ـ آغا امیر حسین شیش محل کتاب گھر

طابع ـ چودھری علی محمد آردو پریس

به اشتراک ـ موسسه مطبوعات قرینکان ـ لاهور ـــــ

باردوم ـ دو هزار ○ [illegible]

فہرست

پہلا حصّہ

بیوی

۱ — وہ مہمات سر کرنے والا ہیجانی خون اب ٹھنڈا پڑ چکا ہے۔ کسی منہ زور سرکش گھوڑے کی طرح تھک کر مطیع ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں دوبارہ کبھی خون کو انسانی رگوں میں اس طرح دوڑتا ہوا نہیں دیکھوں گا جس طرح وہ میرے چچا جم براؤن کی رگوں میں اس وقت دوڑتا تھا جب وہ اپنے تھکے ماندے اور پسینے میں شرابور گھوڑے پہ سوار ہو کر اونچے نیچے علاقہ میں سے گزرا کرتے تھے یا جب وہ اپنے وسیع مویشی خانہ میں کھڑے ہو کر جو بالائی منزل کی طرح فرنیچر سے بالکل خالی ہوتا تھا، آنکھوں میں چمکتی ہوئی چنگاریاں لئے اپنی گھاس اور ڈھوروں کے گلوں کی سلطنت پر دُور دُور تک نظریں دوڑایا کرتے تھے۔

اُن کی ناہموار سلطنت اب ختم ہو چکی ہے اور اس کے حصے بخرے ہو چکے ہیں لیکن میں اب بھی رات کو اپنے بستر پر لیٹتا ہوں تو اس سلطنت کو پچاس سال سے پہلے کی سنہری دھوپ میں لہلہاتے ہوئے اور عروج پر پہنچے

ہوئے دیکھتا ہوں ۔ یہ سلطنت ان کے دروازے سے شروع ہوکر دریا کے ساتھ ساتھ ایک سو بیس میل شمال اور جنوب میں پھیلتی چلی گئی تھی۔ ان کے جانوروں کا باڑا اتنا وسیع تھا کہ اس میں میسا چوسٹس اور کینیٹی کٹ کے پورے علاقے سما سکتے تھے۔ اُن کے مویشیوں کے گلّے یوں بکھرے ہوئے ہوتے تھے جیسے ایک افق سے دوسرے افق تک دار چینی کے سفید دانے بکھرے ہوئے ہوں ۔

غرض کہ اس وسیع علاقے میں چچا برونٹن کی شخصیت افسانوی بن گئی تھی۔ ان کے اصطبل کے گھوڑوں کی نشانی کو ہر کاروباری ادارے میں آسانی سے پہچانا جاتا تھا۔ اُن کی زبان سے نکلا ہُوا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا تھا کسی کتاب میں بند جملوں کی طرح نہیں ، بلکہ ان جلی الفاظ کی طرح جو کسی بلند مقام پر روشن نظر آرہے ہوں۔

مجھے ان کا سونے کے کمرہ یاد ہے۔ کونے میں ایک تخت بچھا ہُوا تھا۔ دیوار پر گھوڑے کی ایال کے بالوں کی بنی ہوئی لگام اور رسیاں لٹکی رہتی تھیں اور ایک خاکی برجیس بھی لٹکی رہتی تھی جس میں جگہ جگہ ڈھول کے چمڑے کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ مجھے ان کی فراخ بیٹھک بھی یاد ہے جس میں نہ گدے بچھے ہوئے تھے۔ نہ مونڈھے نہ کسی اور قسم کا فرنیچر اور جس میں صنوبر کے شہتیروں کی چھت تک آٹے، کھانڈ اور کافی کی لاتعداد بوریوں کے انبار لگے ہوتے تھے۔ اور ڈبوں میں بند تمباکو، خشک پھلوں اور سکھائے ہوئے ٹماٹروں کے پیپے اٹے رہتے تھے۔ اور یہ تمام چیزیں اُن کے کوئی ایک سو ملازموں اور ہر اس شخص کی خوراک تھیں جو اس راستے سے گزرتا تھا خواہ وہ

چرواہا ہو یا آباد کار میکسیکو کا رہنے والا ہو یا ریڈ انڈین، شریف ہو یا آوارہ، اُن کا دسترخوان ہر کس و ناکس کے لئے کشادہ تھا۔

لیکن وہ بات جسے میں بھول نہیں سکتا، وہ منظر جو ہر وقت میری آنکھوں میں بسا رہتا ہے اُن کا موسم بہار میں گھوڑے پر سوار ہوکر اپنی سلطنت کا دورہ کرنا ہے۔ جب چوسات چھکڑے ایری زونا کی سرحد پر کام سے فارغ ہوکر علاقے کے صدر مقام تک پہنچتے تھے اور ان چھکڑوں کے پیچھے پیچھے مویشیوں کا اتنا بڑا گلہ چلتا تھا کہ ویسا گلہ پھر کبھی اس ملک میں نہیں دیکھا گیا۔ آنکھ گرد و غبار میں جتنی دُور تک دیکھ سکتی ہے اس سے بھی دُور تک ہری ہری گھاس پر رنگ برنگے مویشی چکر کاٹتے ہوئے نظر آتے تھے۔ رقابت کے جوش میں سانڈ سینگ میں سینگ پھنسا کر لڑتے تھے، گائیں اور بچھڑے چیختے چلاتے رہتے تھے۔ بے شمار سینگوں کے ٹکرانے کی آوازیں کانوں میں پڑتی رہتی تھیں۔ اور ہم ساٹھ ستر آدمی چاق و چوبند گھوڑوں کی نئی نئی زینوں پر سوار اِدھر سے اُدھر گھوڑے دوڑاتے رہتے تھے۔ اور سارا دن جوش و خروش کے عالم میں گزرتا تھا۔

اس وسیع سبزہ زار میں جو آزاد جنگلی زندگی ہم نے بسر کی وہ میرے نزدیک دیوتاؤں کی زندگی تھی۔ البتہ یہ بات کہ ایک وجود ایسا بھی تھا جو اس زندگی سے ہماری طرح محبت نہیں کرتا تھا۔ بلکہ چپکے چپکے اس سے نہایت نفرت کرتا تھا۔ اس وقت کبھی میرے تصور میں بھی نہ آئی تھی، لیکن اب پچاس سال کے بعد بھی جب اس سبزہ زار میں اس نازک وجود کی موجودگی کا خیال آتا ہے

تو مجھ پر جذبات کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ اس وقت میں محض ایک لڑکا تھا جس کی ابھی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں۔ خزاں کا موسم شروع ہوا تھا۔ اور اس روز میں کیلی فورنیا طرز کی برجس پہنے اور اپنے جوتوں کو رکاب میں ڈالنے کے لئے پائنچے چڑھا ایک سرکش گھوڑی پر سوار سالٹ فورک جا رہا تھا تاکہ وہاں سے مجھے ریاست مسوری کے اسکول روانہ کر دیا جائے ــــ اس سے پہلے کہ میرے چچا تلافے کی نایاب ترین شے اپنے مویشی خانے میں لے آئیں۔ یعنی ایک عورت، جسے ہم نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اور جو اب سینٹ لوئی سے ان سے شادی کرنے کے لئے آ رہی تھی۔

میں قصبے سے باہر کھڑا تیوری چڑھائے آبادکاروں کے ایک پڑاؤ میں بیلوں اور گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا، جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنا بڑا پڑاؤ نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ کسی چیز کا انتظار کر رہے ہیں پھر میں نے اپنی گھوڑی کی لگام کھینچی اور ہوٹل میں آیا۔ یہاں ایک شخص کی زبانی معلوم ہوا کہ ریڈ انڈین لوگوں نے ریٹن کے مقام پر تار کی جو لائن کاٹ دی تھی وہ اب دوبارہ کھل گئی ہے۔

"ہاں یہ تار آپ کے چچا کا ہے جاتے ہی انہیں دے دینا" سرخ چہرے والے اسٹیشن ایجنٹ نے مجھ سے پُراسرار لہجے میں کہا۔

پھر اس نے مجھے ایک بھورے رنگ کا کھلا ہوا کاغذ دیا جس پر پنسل سے کچھ لکھا تھا اور جو سینٹ لوئی سے آیا تھا۔ اس پر تقریباً ایک ہفتہ پہلے کی تاریخ درج تھی میرا خیال ہے کہ یہ پہلا تار تھا جو میں نے اپنی زندگی میں دیکھا تھا اور

اس وقت ایک لمحے کے لئے تو مجھے یہ خیال بھی آیا تھا کہ یہ کاغذ کسی عجیب طریقے سے تار کی لائن کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا خود بخود آ گیا ہے اور یہ کہ اس کی ناقابلِ مطالعہ بھونڈی تحریر دراصل اسی عورت کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جس نے نیچے اپنا نام لوتی لکھا ہے اور محبت کے ساتھ یہ کہا ہے کہ وہ اب پروگرام کے مطابق ڈن ووڈ نہیں ٹھہرے گی۔ بلکہ سیدھی سالٹ فورک اس صبح پہنچ جائے گی جس کے متعلق میں جانتا تھا کہ وہ کل آئے گی۔

مجھے اپنے چچا کو دیکھے دو ہفتے سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ میں اس ناخوشگوار تار کو جیب میں رکھے، برآمد کئے جانے والے مویشیوں کے باڑے کی طرف چلنے لگا۔ مجھے کچھ یہ خیال تھا کہ چچا کے ذبح کئے جانے والے بچھڑوں کا گلہ پہاڑیوں میں سے گزر کر قصبے میں داخل ہو رہا ہوگا۔ بالکل ریو گراندے کی طرح جو گرمیوں کی بارشوں کے بعد، کناروں تک بھرا ہوا بگڈنڈیوں کو ڈبوتا ہوا مویشیوں کے باڑوں اور اصطبلوں کو سیلاب میں بہاتا ہوا کسی کمزور کنارے سے اچھل کر کھیتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے — اور تمام مویشی قصبے میں آ جاتے ہیں اور قصبے کی فضا رات دن ان کی آوازوں سے اس وقت تک گونجتی رہتی ہے جب تک کہ انھیں دساور کو نہیں بھیج دیا جاتا۔

لیکن وہاں نہ دو غلے بچھڑے تھے، نہ میرے چچا تھے۔ پھر میں دھند میں لپٹی ہوئی، کچی اینٹ کی بنی ہوئی عدالت کی طرف چلا گیا۔ جہاں ہمارے دو کارندوں کے خلاف اس جرم میں مقدمہ چل رہا تھا کہ انھوں نے ایک نو آبادکار پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ عدالت میں اتنا ہجوم تھا کہ میں بمشکل دروازے ہی تک پہنچ سکا۔

لیکن وہاں سے بھی مجھے نوجوان ڈسٹرکٹ اٹارنی کی خطیبانہ آواز سنائی دے رہی تھی۔ جو مشرقی اضلاع کے علاقہ کا باشندہ تھا۔ اور ان دنوں صدر امریکہ سے بہت گہرے روابط رکھتا تھا۔ وہ میرے چچا کے وسیع و عریض علاقے کے جابرانہ طور طریقوں پر بڑی سختی سے لے دے کر رہا تھا۔ اور اپنے ضلع میں بسے ہوئے تمام آباد کاروں کو نئے انصاف کا یقین دلا رہا تھا۔ اس کا ضلع وائیو گرانڈ سے لے کر ایری زونا کی سرحد تک پھیلا ہوا تھا۔

جب سماعت دوسرے دن تک کے لئے ملتوی ہوگئی تو میں سنجیدگی سے باتیں کرتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا اپنے چچا کے وکیل ہنری میکر ٹن کے پاس پہنچا۔ جو خاصا موٹا تھا۔ اس نے اپنی جھکی ہوئی بڑی بڑی مونچھوں کے اوپر سے نظر ڈالتے ہوئے دہ تارہ پڑھا۔

پھر وہ گویا بات کی تہہ تک پہنچ کر بولا " میں نے کرنل صاحب کو اس وقت سے نہیں دیکھا جب سے سماعت شروع ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے بیٹا! تم خود کل صبح اس عورت سے مل لو تو بہتر ہے"

میں اس رات اکیس چینج ہاؤس کی خواب گاہ میں پڑا کافی دیر تک جاگتا رہا۔ یہ نے والا کمرہ چچا کے لئے وقف تھا، کیونکہ جب وہ قصبے میں آتے تھے تو یہیں سوتے تھے۔ میں تقریباً ساری رات اس عورت کے خلاف نفرت محسوس کرتا رہا جو مجھے جلا وطن کر کے ضروری سمجھ رہی تھی۔ اور یہ سوچتا رہا کہ میں نے اس قصبے کو اس حالت میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا یعنی لوگوں کا بے پناہ ہجوم کرایہ کے اصطبل اور میدان گھوڑوں سے بھرے ہوئے، وہ عجیب رات تھی۔ رقص گاہ کی

کھلی کھڑکیوں سے پیانو کے سُروں کا زیروبم اور سارنگی کی تیز آوازیں کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں۔ دسیوں بیسیوں شراب خانوں سے پیالوں کے ٹکرانے کی ہلکی ہلکی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں اور مردوں اور کھلنڈری مزاج عورتوں کا وہ باہم باتیں کرنا، قہقہے لگانا، اونچے سُروں میں گیت گاتے ہوئے اُدھم مچانا، جو کبھی رکتا بھی تھا تو اس طرح جیسے توپ ایک گولا چھوڑ کر دوسرا گولا چھوڑنے کی تیاری کرنے لگی ہو۔

لیکن اس سارے شور وغوغا کے باوجود لکڑی کے اُن تختوں پر پڑتے ہوئے جوتوں کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ جو ایک شراب خانہ کو دوسرے شراب خانہ سے ملاتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ یہ تمام لوگ جو سو سو دو دو سو میل کے فاصلے سے چل کر آئے ہیں مویشیوں کی تجارت کرنے نہیں آئے انھیں یہاں کھینچ لانے والی چیز تھی وہ مقدمہ اور مشرق سے آنے والا وہ نیا اور نوجوان ڈسٹرکٹ اٹارنی جو میرے چچا اور دوسرے بڑے مالکان کے اختیار کو للکار رہا تھا۔ میں اپنی لمبی چوڑی مسہری پہ بیٹھا ہوا بڑی کھڑکی سے آباد کاروں کے سفید خیموں اور گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا جن پر موٹی چادریں تنی ہوئی تھیں اور جو دُور سے دھوکا دینے والی دلدلوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔

جب میں اگلی صبح بیدار ہُوا تو مجھے یہ جان کر بڑا افسوس ہُوا کہ میرے سوتے ہوئے ایک بار پھر گولیاں چلی ہیں اور ایک آدمی ہلاک ہو گیا ہے۔ میں ڈپو کی طرف گیا تو میں نے دیکھا کہ مقتول کے بیل ابھی تک اس کی گاڑی سے بندھے ہوئے تھے۔ دس بارہ بیل اپنے اپنے جوئے میں جُتے ہوئے بڑے اطمینان سے

بیٹھے جگالی کر رہے تھے مقتول کی لاش ریل کی پٹڑی کے پاس حوض کے کنارے پیڑ
لٹکی ہوئی تھی جو لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اس کے جوتے کسی کمینہ فطرت چور کے پاؤں کی
زینت بن چکے تھے۔ حوض کا پانی رس رس کر لاش پر گر رہا تھا۔ اور اس کا سر
ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا۔ مقتول کی ایک ٹانگ حیرت انگیز حد تک لمبی نظر
آ رہی تھی۔ جیسے وہ زمین تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔

ضلع کے افسر نے نئے ڈسٹرکٹ اتھارٹی کی سخت ہدایات کے مطابق لاش
کو وہاں سے اتار کر عارضی طور پر گاڑی کی چادر کے نیچے رکھ دیا لیکن جونہی سارے
عہدہ دار عدالت میں گئے مقتول کے چند دوست لاش وہاں سے اٹھانے
لگے۔ میں عدالت کی گھنٹی اور پلیٹ فارم پر چلتے ہوئے لوگوں اور چھکڑوں کی آوازیں
بھی سنتا رہا۔ اور اس کی لاش کو بھی وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ایک شخص کسی
گھوڑے کی لگام اٹھا لایا، اور لوگ لاش کو اس سے باندھنے لگے۔ جب میں وہاں
سے مڑا تو سینٹ لوئی سے آنے والی گاڑی خاصی قریب آ گئی تھی۔ اس کے ڈبے
چھوٹے چھوٹے تھے جن پر مسافروں کی گرد جمی ہوئی تھی۔

مجھے اب تک یہ توقع تھی کہ چچا آخر وقت تک ضرور پہنچ جائیں گے لیکن
وہ نہ آئے۔ اور میں اپنے ذہن پر زور ڈال کر یہ سوچنے لگا کہ میں اس عورت
کو کیسے پہچانوں گا۔ اور پہچان بھی لوں تو اس سے کیا باتیں کروں گا۔ جب چچا
اپنے علاقے میں ہوتے تھے تو بس اپنے کام سے کام رکھتے تھے لیکن شہر کینسس
میں جہاں وہ اپنے مویشی فروخت کرنے کے لئے باقاعدگی سے جایا کرتے تھے،
لوگ کہتے ہیں کہ وہاں ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ اور جب ایک دفعہ

ایک مشہور کمیشن ایجنٹ نے جسے چچا پسند نہ کرتے تھے ان کی ایسی خوشامدیں کیں جو اُن کے کاروباری اصولوں کے خلاف تھیں۔ یعنی اس نے چچا کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت کا اہتمام بھی کیا تو چچا نے ہمیشہ کے لیے اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہ ترکیب چلی کہ وہ اپنے ساتھ ایک بدنام کھلاڑی عورت کو لے گئے جس نے بہت بھڑکیلا اوباشانہ لباس پہن رکھا تھا۔

اور اب میں یہ سمجھ رہا تھا کہ سینٹ لوئی سے آنے والی یہ عورت بھی بہت کھائی کھیلی، بے تکلف اور بنی سنوری ہوگی۔ جسے میں نے یقیناً پہلے ہی سے سالٹ فورک کی لکڑی سے بنی ہوئی پٹڑیوں پر بھڑکیلے ریشمی کپڑے پہنے اور انہی کپڑوں کے رنگ کی خوبصورت زنانہ چھتری لگائے دیکھا ہوگا۔ اور وہ گرینا لوڈ بازار میں سے گزرتے ہوئے اپنی جرابوں کی لال اور سفید دھاریاں دکھاتی پھری ہوگی۔

لیکن جو کچھ میں نے دیکھا یہ تھا کہ ایک عورت ریل گاڑی کے ڈبے کے پاس کھڑی تھی اور اس کے پیچھے ایک ڈاڑھی والا مریکسن ہاتھوں میں دو تھیلے اٹھائے بڑے ادب سے کھڑا تھا۔ اس عورت کا چہرہ ایک موٹی سی بھوری نقاب سے چھپا ہوا تھا۔ لیکن اس نازک اندام کے کھڑے ہونے کے انداز میں کچھ ایسی ناقابل فراموش بات تھی کہ بھلائے نہیں بھولتی۔ لباس بہت بیش قیمت اور اعلےٰ قسم کا تھا۔ اور سلا ہوا بھی اچھا تھا۔ ہاتھوں میں دستانے پہنے ہوئے سر پر کلغی والا ہیٹ رکھے ہوئے ایک نسوانی نازک جسم تن تنہا کھڑا کمبل میں لپٹے ہوئے ریڈ انڈین لوگوں، منگولوں کی نسل کے میکسیکو کے لوگوں اور ان بدوضع سفید آدمیوں کو دیکھ

رہا تھا۔ جن کی کمر میں کارتوسوں کی پیٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور جن کے ہاتھوں میں خاردار سانٹے لہرا رہے تھے۔ اور ان کے سروں کے پار پانی کے حوض کے پاس اس مردہ آدمی کی لاش ابھی تک لٹکی ہوئی تھی۔

ایک لفنگے نے جو مرگ چھالا کی رنگین بوشرٹ میں ملبوس تھا۔ جس کے پھول بوٹے کافی عرصے کے مٹے ہوئے معلوم ہوتے تھے، کچھ کہا اور میری طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ میری طرف بڑھی۔ اس نے اپنی زبان سے اس وقت تک ایک لفظ بھی نہ نکالا۔ جب تک وہ میرے اس قدر قریب نہ آگئی کہ مجھے اس کے جسم سے غازے اور عطر کی خوشبو آنے لگی۔ اور اس کی نقاب کے پار آنکھوں کی چمک دکھائی دینے لگی۔ پھر اس نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھائی۔ اور اگرچہ میں اس وقت ایک لڑکا ہی تھا۔ میں نے اپنے اندر ایک سرور انگیز جذبہ بیدار ہوتے محسوس کیا وہی جذبہ جو اس کے بعد بھی ہمیشہ جب کبھی میں نے اسے دیکھا محسوس ہوا۔

"تو یہ ہے ہال؟" اس نے بڑی نفاست سے کہا۔ اور مجھے چوما، اور میں وہاں اپنے نوجوان جسم کو سختی سے اکڑائے کھڑا رہا۔ میرا چہرہ سب کے سامنے مارے شرم کے سرخ ہوگیا، لیکن اس عورت نے میرے سرخ چہرے کو اگر دیکھا بھی تو ظاہر بالکل نہ کیا۔ مقتول کی لاش کو اس کے سامنے سے آہستہ آہستہ لے جایا جا رہا تھا اور وہ مجھ سے قدرے بے ربطی کے ساتھ مگر بڑے دلفریب انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔ اس نے بڑی اچھی اور ہنسنے ہنسانے والی باتیں کیں، اور اس طریقے سے کہ مجھے جواب دینے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ گفتگو کے دوران اس کا چہرہ میری طرف اس طرح مستقلاً رہا جیسے چچا کے مویشی خانے میں اس

وقت میرے اور اس کے سوا کوئی نہیں ہے، نہ نزدیک ہی بنا ہُوا حوض اور نہ گھومتے ہوئے لفنگوں کا گروہ، ان چیزوں کو تو اس نے بالکل نظرانداز کردیا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی ملائمت اور جسم کے گداز سے مجھے محسوس ہُوا کہ میرے ان لمبے سیاہ بالوں سے اتنی ملائم چیز کبھی مس نہیں ہوئی، اور میرے لگاموں اور رسّیوں کے عادی سخت ہاتھوں نے کبھی ایسی گداز چیز کو نہیں چھوُا۔

جب میں نے جھجکتے ہوئے اُسے یہ بتایا کہ آپ کا تار کل شام ہی ملا ہے اور یہ کہ میں ابھی تک یہ تار اپنے چچا کو نہیں دے سکا ہوں تو اس نے ایک ایسے انس سے میرا بازو پکڑ لیا جس میں زندگی تھی۔

"کوئی بات نہیں ہم دونوں مل کر انھیں ڈھونڈ لیں گے، ہاں!" اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"آپ ہوٹل چلئے۔ وہ وہیں آجائیں گے۔" میں نے کہا۔

اُس نے جواب دیا: "ہاں سامان ہوٹل جا سکتا ہے لیکن میں ابھی نہیں جاؤں گی۔ میں کئی دن ریل کے ڈبے میں قید رہی ہوں اب ذرا گھومنے پھرنے کو جی چاہتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم چلتے ہی رہیں، چلتے چلتے میلوں کا فاصلہ طے کر لیں حتیٰ کہ تمہارے چچا ہمیں خود بخود مل جائیں۔"

میں یہ سوچتے ہوئے کہ سینٹ لوئی کی عورتوں کا دماغ ذرا خراب ہوتا ہے۔ بادلِ ناخواستہ اسے لے کر کچے راستے پر چلنے لگا، جہاں جگہ جگہ سینگ، ہڈیاں اور بھیڑوں کی کٹی ہوئی ٹانگیں بکھری ہوئی تھیں۔ کبھی ہم چھکڑوں کے درمیان سے ہو کر چلنے لگتے اور کبھی گھوڑیوں کے نعلوں کے نشانوں پر سے گزرنے لگتے۔ آخرکار

ہم لکڑی کے تختوں کی بنی ہوئی پٹڑی پر آ گئے۔ پٹڑی پر آتے ہی میں نے یہ احتیاط کی کہ آپ سے عدالت کی مخالف سمت میں لے گیا۔ لیکن میں اس مردہ شخص کے چھکڑے سے نہ بچ سکا جس کے پہیوں پر بچے چڑھے ہوئے تھے۔ اور اس چیز کو دیکھ رہے تھے جو اب ہمیں بھی صاف صاف نظر آ رہی تھی۔ یہ اس شخص کی لاش تھی۔ وہ مردہ حالت میں چت لیٹا ہوا تھا۔ اس کی لال ڈاڑھی چہرے پر پڑے ہوئے نیلے رومال سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ لیکن شکر ہے کہ لوئی کیمرن برابر باتیں کرتی رہی۔ اب تو اس کے نرم و نازک ہاتھ نے میرا بازو بھی تھام لیا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہرنی کی ملائم کھال مجھ سے مَس ہو رہی ہے۔

علاقے کے اور لوگوں کی طرح مجھ میں بھی یہ غرور تھا کہ پیدل چلنا تو کسی بیلچہ دار مزدور کی نشانی ہے اور یہ بڑی بے عزتی کی بات ہے۔ چنانچہ جب لکڑی کی پٹڑی ختم ہو گئی تو میں بہت خوش ہوا۔ لوئی کیمرن نے اپنی نقاب دوبارہ گرا دی تھی مگر اس کے چہرے کے تیکھے نقوش صاف صاف نظر آ رہے تھے۔ اور وہ مسلسل باتیں کیے جا رہی تھی ہم ادھر ادھر بکھرے ہوئے میکسیکو کی وضع کے مکانوں کے پاس سے گزر کر ڈھلوان ریتلی پہاڑیوں پر چڑھنے لگے۔ وہاں ایک جگہ اس علاقے کے خاص پیلے پیلے پھولوں کو کھلا ہوا دیکھ کر وہ خوشی کے مارے اچھل پڑی۔ اس نے ایک تازہ پیلا پھول توڑ کر اپنے کوٹ میں لگا لیا۔

لیکن جب ہم پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے تو یوں محسوس ہوا جیسے ہم بے خبری میں اچانک سمندر میں آ گئے ہیں۔ ہمارے سامنے وسیع بھورا، خالی خالی سا میدان تھا جو ایک سوکھے سمندر کی طرح بے آب و گیاہ معلوم ہوتا تھا۔ میدان کو دیکھ کر

وہ دفعتہً یوں رک گئی جیسے خاردار تاروں سے اُلجھ گئی ہو۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے دور، قریب قریب دکھائی نہ دینے والا ایک سفید سایہ دکھانا چاہا۔ جہاں ہمارا مویشی خانہ تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری باتیں نہیں سن رہی ہے۔ وہ تو برابر اس ہم سفر کی باتیں کئے جا رہی تھی جو اُسے فورٹ ایوننگ کے اسٹیشن پر مل گیا تھا اور سارے راستے ٹرین میں اس کے پاس بیٹھا عجیب دلچسپ باتیں سناتا رہا تھا۔ اپنے ہم سفر کی باتیں سنانے کے ساتھ ساتھ وہ آباد کاروں کے سفید خیموں اور اُن چھکڑوں کی طرف بھی دیکھتی رہی جن پر سفید چادریں تنی ہوئی تھیں۔ یہ بالکل ایک بسا ہوا گاؤں معلوم ہوتا تھا جہاں زندگی بے حد مصروف تھی۔

وہ پہاڑی کی چوٹی پر کھڑی   ہنس ہنس کر ان بیبیوں، بچوں کی طرف ہاتھ ہلا رہی تھی جو نیچے زمین پر گویا رینگ رہے تھے، لڑکھڑا رہے تھے، اور چیخ رہے تھے اور وہ بار بار بڑے خوبصورت انداز میں سر ہلا کر ان تھکی ہاری عورتوں کے سلام کا جواب دے رہی تھی جو گھاس پر حلقہ بنائے کچھ سی رہی تھیں اور کچھ بُن رہی تھیں اور جو بعد میں اُسے کوئی بڑی خاتون سمجھ کر جو ان کے غریب گھرانوں کا معائنہ کرنے آئی تھی، اس کا استقبال کرنے کے لئے کھڑی ہو گئی تھیں۔

اور جب اُن عورتوں نے یہ بتایا کہ ہم تمہارے اپنے منزوری سے دور دراز فاصلے طے کر کے آتے ہیں اور اب اس وسیع میدان میں آباد ہونا چاہتے ہیں، تو اس کی آنکھوں میں میں نے ایک ایسی چیز دیکھی جو اس سے پہلے نہ دیکھی تھی، پھر وہ ہنس ہنس کر بڑی بوڑھیوں سے باتیں کرنے لگی جن کے چہروں پر ریڈ انڈین قبیلے کے افراد کی طرح جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور جن کے ہونٹوں پر ہاتھ کی بنی

ہوئی تو یہاں تھیں، پھر اس نے ایک چھوٹے سے بچے کو گود میں لے کر ہوا میں اُچھالا۔ اور پھر وہ اُن بچوں کو پکڑنے کے لیئے اُن کے پیچھے دوڑنے لگی جو اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ پھر وہ خوشی خوشی ایک چھکڑے پر چڑھ گئی جس کی چھتری باہر کو نکلی ہوئی تھی، میں وہیں کا وہیں کھڑا اس کی عجیب و غریب حرکات پر کوفت محسوس کرتا رہا۔ میں نے سنا کہ وہ چھکڑے کے مالکوں کو مبارک باد دے رہی ہے کہ اچھا ہوا تم یہاں آباد ہونے کے لیئے آ گئے۔

اس نے چھکڑے سے باہر نکلنے سے پہلے کہا: "اگر آپ کو کرنل ہیروٹن نظر آئیں تو ان سے کہیں کہ ہم انہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں"

میں نے دیکھا، جیسے پورے کیمپ پر کالا سایہ چھا گیا ہے۔ حتیٰ کہ بچے بھی میرے چچا کا نام سُن کر کانپنے لگے۔

ایک دبلے پتلے مزدوری کے باشندے نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا: "مادام میرا خیال ہے، وہ آج آپ کو عدالت میں ملیں گے"

لوئی کیمرن چپ چاپ میرے ساتھ چلتی رہی، حتیٰ کہ ہم اسی طرح خاموش چلتے ہوئے کوئی دو فرلانگ آگے بڑھ گئے۔

آخرکار اس نے پوچھا "ہاں! وہ لوگ ہمیں عجیب نظروں سے کیوں تک رہے تھے؟ اور تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا کہ وہ عدالت میں ملیں گے؟"

"ہم وہاں اندر کیسے جا سکتے ہیں" میں نے قدرے رُکھائی سے جواب دیا۔

اور جب ہم چوک میں پہنچے تو میں نے دیکھا کہ عدالت میں لوگوں کا ایک

جمگھٹا ہے جو تختوں والی پٹڑی سے شروع ہو کر عدالت کے جنگلے تک پہنچا ہوا ہے۔ میں اس وقت ایکس چینج ہاؤس جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ چلتے چلتے اچانک رُک گئی۔ اس نے اپنا سر مخصوص انداز میں اوپر اٹھایا ہوا تھا جس سے میں اب تک خاصا مانوس ہو چکا تھا۔ بیسیوں مردوں کے پاس کھڑی ہوئی ایک خوبصورت نازک اندام عورت بہت ہی عجیب لگ رہی تھی۔

"ذرا ہمیں گزر نے دیجئے" اس نے بڑی بے تکلفی سے صاف صاف کہا، اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی طرح حدار نسوانی آواز سن کر وہ جاہل لوگ اپنے سروں سے ہیٹ اتار اتار کر یوں الگ کھڑے ہو گئے جیسے انہیں کوئی گولی آ لگی ہو۔

اب ہمارے سامنے ایک چھوٹا سا تنگ راستہ بنا ہوا تھا۔ لوگوں سے گھرے ہوئے اس راستے پر چلتے ہوئے ہم جلدی ہی عدالت کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ بلیک جیک کیرنز نے جو علاقے کا مشہور غنڈہ تھا، جلدی سے اٹھ کر اس خاتون کو اپنی سیٹ پیش کر دی اور بنچ پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے تھوڑا تھوڑا سا سرک کر میرے بیٹھنے کے لئے چند انچ جگہ مہیا کر دی۔

۳ ـــــ جس طرح مویشیوں کا باڑا اس وقت بدبودار اور کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے جب مویشیوں کو ذبح کیا جانے والا ہوتا ہے اسی طرح سالٹ فورک کی عدالت

میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ اور بدبو کے مارے دم گھٹا جا رہا تھا۔ عدالت کیا تھی کچی اینٹ کا بنا ہوا ایک تاریک کمرا تھا جس کا فرش کچا اور مٹی سے لپا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کے پاس لوگ پتھر کے بنچوں پر اس طرح بیٹھے تھے کہ کھڑکیوں سے آنے والی تھوڑی بہت روشنی بھی مدھم پڑ گئی تھی۔ عدالت کے کمرے میں داخل ہوتے ہی یوں لگا جیسے ہم شام کے جھٹ پٹے میں کسی پُراسرار جگہ آ گئے ہیں۔

"ہاں! کیا تمہارے چچا یہاں ہیں؟" لوسی کیمرن نے اپنی نقاب اُٹھائے بغیر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

لیکن اس سے پہلے کہ میری آنکھیں کمرے کی تاریکی سے کچھ مانوس ہوتیں میں نے وہاں کے ماحول ہی سے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ میرے چچا یہاں نہیں ہیں۔

"ہوشیار! ارکانِ جیوری تشریف لا رہے ہیں" میرے پیچھے کھڑے ہوئے ایک گوالے نے آہستہ سے کہا۔

میں نے اب دیکھا کہ جیوری کے بیٹھنے کی جگہ صنوبر کی پُرانی گھسی پٹی بنچیں خالی پڑی تھیں۔ پھر میں نے اپنے پیچھے دروازے میں لوگوں کے ہلنے جلنے اور اپنی اپنی جگہ سے سرکنے کی آوازیں سنیں۔ اور پھر انسانی جوش و خروش کی وہ لہر بھی محسوس کی جو کمرے کے عقبی حصے سے شروع ہو کر ایک بنچ سے دوسری بنچ پر ہوتی ہوئی آخرکار ملزموں کے کٹہرے میں پہنچ گئی۔ جہاں میں نے دیکھا کہ ہمارے دونوں ملزم کارندے اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے کچھ پریشان ہو گئے ہیں۔ اور ہمارا وکیل ہنری میکرٹن ایک پہاڑ کی طرح یوں مُڑا جیسے اس میں

جان پڑ گئی ہو۔

میں نے محسوس کیا کہ لوٹی کیمرن کی دستانوں میں مقید انگلیاں میرے بازو سے مَس ہو گئی ہیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے ہال ؟" اس نے مجھ سے آہستہ سے پوچھا۔

پھر میں نے لوٹی کی نقاب کے پیچھے چھپی ہوئی چمک دار آنکھوں سے یہ اندازہ کیا کہ اس نے ابھی ابھی کوئی نئی چیز دیکھی ہے۔ چنانچہ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے ایک مانوس، مغرور اور متکبر چہرہ دیوار کے ساتھ ساتھ غلی راستے پر چلتا ہوا نظر آیا جو لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا آ رہا تھا۔ اس کا لمبا بھورا موٹے کپڑے کا کوٹ پیچھے سے کھلا ہوا تھا۔ اور اس کے سامنے کے دامن گول ترشے ہوئے تھے۔ کوٹ بائیں طرف سے کچھ ابھرا ہوا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ ہاتھی دانت کے قبضے والا پستول ہے۔ اس کی کوئلے کی طرح سیاہ بھویں اور مونچھیں گرد کی وجہ سے سفید نظر آ رہی تھیں۔ اور کمرے کی یکایک پیدا ہو جانے والی خاموشی میں اس کے جوتوں کی کیلوں والی ایڑیاں یوں پڑ رہی تھیں جیسے پستول سے تڑ اتڑ گولیاں نکل رہی ہوں۔

اس دن کے بعد میں کتنی ہی عدالتوں میں گیا ہوں، لیکن میں نے پھر کبھی ایسا منظر نہیں دیکھا کہ ایک تنگ و تاریک کمرا صرف ایک شخص کی عظمت اور طاقت کی کرنوں سے یوں یکایک جگمگانے لگا ہو۔ چنانچہ وہ منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے اسی طرح صاف صاف گھوم رہا ہے جیسے چیزیں دوپہر کی اجلی دھوپ میں چمکنے لگتی ہیں۔ جج کی بنچ کے پاس تازہ تازہ سفیدی پھری ہوئی

دیوار پر امریکہ کا جھنڈا لگا ہوا تھا جس کے رنگ گرد وغبار کے باعث کچھ اور ہی بن گئے تھے۔ جج صاحب کا چغہ سیاہ رنگ کا تھا جس کے حاشیہ پر سنہری جھالر تھی۔ ان کی گھڑی کی زنجیر کی سنہری کڑیاں اندھیرے میں خوب چمک رہی تھیں۔ ملزموں کے کٹہرے میں دو ملزم اپنی اپنی جگہ کھڑے پریشان نظر آ رہے تھے۔ اور میرے نڈر اور بے باک چچا کی مؤثر شخصیت یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ اپنے علاقے کا مطلق العنان اور جابر بادشاہ ہے۔

پھر میں نے دیکھا کہ ان کی عقابی تیز آنکھوں نے ہمیں ڈھونڈھ لیا ہے اور وہ لوگوں سے بچتے بچاتے ہماری ہی صف کی طرف آ رہے ہیں۔ وہ جن لوگوں کے درمیان سے نکلنا چاہتے تھے وہ فوراً ان کے سامنے سے یوں ہٹ جاتے تھے جیسے بھیڑ بکریاں ہٹ جاتی ہیں۔ وہ چند ہی منٹوں میں ہمارے پاس آ گئے۔ چچا اس وقت سر سے ننگے تھے اور ان کے کھڑے ہونے کے انداز میں ایک خاص وقار تھا۔ انھوں نے آتے ہی لوئی کیمبرن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت سے دبایا۔ بڑے اطمینان سے خیریت پوچھی صحت کا حال دریافت کیا۔ ان کا چوڑا اُبھرا ہوا چہرہ کسی سنسان ٹیلے پر پڑتی ہوئی دھوپ کی طرح آہستہ آہستہ تپنے لگا۔

انھوں نے ہم سے صرف اتنا کہا کہ وہ ہمیں سماعت کے بعد ملیں گے پھر انھوں نے اپنی سیاہ آنکھوں سے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا جو ہماری باتیں سُن رہے تھے۔ پھر وہ بڑے شاہانہ انداز میں آگے بڑھ گئے۔ اور وکیلوں کے خاص کٹہرے میں داخل ہو گئے جہاں ہنری میکرٹن ان کا شاندار استقبال کرنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ دونوں ملزم کارندے کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے۔ ناظر عدالت

نے اُن کے لئے جلدی سے ایک افسروں والی کرسی لا کر رکھ دی۔ اس اثناء میں ضلع کا کلرک اپنے کان پر قلم رکھے احترام کے ساتھ انہیں دیکھتا رہا۔ اور جج وائٹ جن کے چہرے سے بیزاری ٹپک رہی تھی اپنی صنوبر کی بنچ پہ بیٹھے بیٹھے بڑے دوستانہ انداز میں مسکرانے لگا۔ چچا نے سر کے اشارے سے ان لوگوں کے سلام کا جواب دیا۔

کٹہرے میں کھڑے ہوئے صرف ایک آدمی نے کسی قسم کی تعظیم وغیرہ کا اظہار نہ کیا۔ اور وہ تھا صدر کا مقرر کردہ نوجوان ڈسٹرکٹ اٹارنی برائس چیمبرلین جسے میں بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا قد لمبا اور شخصیت بڑی اثر آفریں تھی۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے سفید کوٹ کے سارے بٹن سفید کالر تک بند تھے۔ اس کی خوفناک بھویں اوپر چڑھی ہوئی تھیں اور سنہرے گھنے بال بڑی چابک دستی اور خوبصورتی سے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔

لوئی کیمرن نے مجھ سے آہستہ سے پوچھا "ہال! یہ کس کا مقدمہ ہے؟ اور یہ بدمزاج سا آدمی کون ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کٹہرے کے پیچھے والا ہلکے نیلے رنگ کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور چند آدمی ایک قطار میں آگے پیچھے چلتے ہوئے داخل ہوئے ان میں سے کچھ بھدّے امریکی تھے۔ جنہوں نے کھلے گریبان کی صدریاں پہنی ہوئی تھیں اور کچھ چمڑے کی جرسیوں میں ملبوس ذرا ہٹے کٹے میکسیکو کے باشندے تھے۔ اُن میں سے ہر ایک نے عدالت کے کمرے میں داخل ہوتے ہی احترام کے طور پہ اپنی ٹوپی سر سے اٹھائی اور پھر رکھ لی۔ کچے فرش پر اُن کے جوتوں

کی رگڑ سے عجیب آوازیں پیدا ہورہی تھیں۔

میرے پیچھے کھڑے ہوئے ایک شخص نے کسی قدر بلند آواز سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا "اگر یہ جج بروٹن کا مقدمہ نہ ہوتا تو جیوری کھانے کے بعد اپنا فیصلہ سناتی۔" پھر میں نے دیکھا کہ جیوری کا سرخ و سفید صدر ایلی جونز جج وائٹ کے سوالات کا جواب دے رہا ہے۔

اس نے ایک ایک لفظ کو گویا چباتے ہوئے کہا "ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اہنڈریو بوگنز پر چند نامعلوم لوگوں نے اسی مقام پر گولی چلائی، جہاں وہ آباد ہونا چاہتا تھا۔"

میں نے جج کے سرخ چہرے کو سخت ہوتے ہوئے دیکھا، جیسے اسے کوئی بات ناگوار گزری ہو۔

جج نے جیوری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کوئی فیصلہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دونوں ملزم . . . ."

ایلی جونز نے ہاتھ اٹھا کر کہا "یہ دونوں اقدامِ قتل کے الزام سے بری ہیں۔"

میں خوشی کے مارے قدیم قبائلیوں کا سا جنگی نعرہ لگانا چاہتا تھا کہ میرے پیچھے بیٹھے ہوئے چرواہوں نے کچے فرش پر اپنے جوتوں سے طرح طرح کی آوازیں پیدا کرنی شروع کر دیں، اور کچھ تو سیٹیاں بجانے لگے۔ جج وائٹ نے غصے میں آ کر زور سے اپنے بنچ پر ہاتھ مارا۔ اور ایک بار پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ پھر اس نے صدر سے جو ابھی تک کھڑا ہوا کھسیانی سی ہنسی ہنس رہا تھا اپنا فیصلہ تحریری

شکل میں پیش کرنے کو کہا۔ اور اجلاس برخاست کر دیا۔

"ہاں! کیا تم یہی فیصلہ چاہتے تھے؟" لوئی کیمرن نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں نہ مجھ پر تھیں نہ رہا شدہ گوالوں پر، بلکہ دراز قد نوجوان ڈسٹرکٹ اٹارنی پر جمی ہوئی تھیں۔ جو اس وقت اتنی تکلیف میں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ ابھی ابھی گھوڑے سے گرا ہے۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد لوئی نے مجھے بنچ سے اٹھایا اور میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نشستوں کے درمیان بنے ہوئے راستے پر چلنے لگی۔ ہر قدم پر وہ مجھ سے ایک نئی بات کرتی تھی جو خلوص اور محبت سے پُر ہوتی۔ پھر وہ کٹہرے میں داخل ہو گئی۔ اور میرے چچا کے پہلو میں جا کھڑی ہوئی اور بڑی نزاکت سے اپنا بازو اُن کے بازو میں ڈال دیا۔ عین اس وقت برائس چیمبرلین نے اپنا ہاتھ بڑھا کر ہنری میکریٹر سے مصافحہ کیا۔ اور اُسے آج کی کامیابی پہ مبارک باد دی۔

پھر شکست خوردہ نوجوان ڈسٹرکٹ اٹارنی میرے چچا سے مخاطب ہوا "کرنل برونٹن! کیا میں آپ سے چند باتیں پوچھ سکتا ہوں، جن کا موقع مجھے سماعت کے دوران میں نہیں ملا۔"

اُس کے پوچھنے کے انداز میں سلیقہ تھا۔ لیکن اس کی آواز میں دوسرے کو للکارنے والی باغیانہ لہر تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی جس نے اس کٹہرے میں کھڑے ہوئے ہم سب آدمیوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ وہ میرے چچا کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہتا رہا "کرنل برونٹن کیا یہ سچ ہے کہ آپ کا علاقہ شمالاً جنوباً ایک سو میل سے بھی زیادہ پھیلا ہوا ہے اور مغرب میں ایری زونا کی

سرحد تک جا پہنچا ہے ؟ "

میرے چچا نے صرف اپنا سر آہستہ سے ہلایا۔

چیمبرلین کی آواز رفتہ رفتہ بلند ہوتی جا رہی تھی "کیا یہ سچ ہے کہ یہ وسیع عریض علاقہ جس پر آپ قبضہ کئے بیٹھے ہیں آپ کی ملکیت میں اس کا بہت تھوڑا سا حصہ ہے صرف چند کنویں جو آپ کے نام پر یا آپ کے آدمیوں کے نام پر چڑھے ہوئے ہیں، کیا یہ سچ ہے کہ اس علاقہ کا بیشتر حصہ اب بھی حکومت کا ہے ؟ "

" ہاں، فقط قانونی طور پر" میرے چچا نے آخر کار کہا۔

چیمبرلین نے اپنی آواز میں قوت اور غصہ پیدا کرتے ہوئے ختم کلام کے طور پر کہا "تو کیا پھر یہ سچ ہے کہ یہ لاکھوں ایکڑ زمین جو حکومت کی ملکیت ہے، وہی زمین ہے جس کے صرف ایک سو ساٹھ ایکڑ پر اینڈ ریو لوگنز کھیتی باڑی کرنا چاہتا تھا۔ اور جس کے باعث نامعلوم اشخاص نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا "

"نہیں"۔ میرے چچا نے آہستگی، مگر اعتماد سے کہا " اس پر حملہ اس لئے نہیں ہوا کہ وہ ایک سو ساٹھ ایکڑ زمین پر کھیتی باڑی کرنا چاہتا تھا، بلکہ محض اس لئے ہوا کہ وہ اس پر قبضہ کرنا چاہتا تھا "

ان دو اشخاص میں سے ایک فولاد معلوم ہوتا تھا اور دوسرا چقماق، اور ان کی رگڑ سے ایسی چنگاریاں پیدا ہو رہی تھیں کہ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ ہم اس وقت کہاں ہیں۔ اب مجھے لوگوں کی حمایتی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے گھوم کر دیکھا کہ کٹہرے کے پرے ہمارے گواہ اور چرواہے اس فیصلے پر بڑے خوش نظر آرہے ہیں۔

مراٹس چیمبرلین نے گھوم کر دیکھا، لیکن اس کی چمکدار نیلی آنکھوں میں کوئی

چیز جھلائی ضرور۔ اس کا رویّہ تبدیل ہوگیا۔ اس کے چہرے کے تاثر اور اس کی آواز سے التجا نمایاں ہورہی تھی۔ جب وہ اپنی جگہ کھڑے کھڑے میرے چچا کی طرف بڑے لبھا لینے والے اور مانوس انداز میں جھکا تو ایک لمحے کے لئے مجھے یوں لگا کہ وہ برا آدمی نہیں ہے۔

اس نے کہا "کرنل بروٹن! آئیے اس معاملے کو فراموش کر دیں۔ انڈریو بوگز ایک تنہا شخص تھا اور عدالت نے بھی اس کا معاملہ ختم کر دیا ہے۔ سالٹ فورک کے دوسرے سرے پر ایسے بے شمار لوگ کھڑے ہیں جو آباد ہونے کے آرزومند ہیں۔ اور اس مقدمے کے فیصلے کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ تنہا نہیں ہیں۔ اُن کے ساتھ خاندان ہیں اجڑے پڑے کنبے ہیں، دادیوں سے لے کر شیر خوار بچے تک ہیں۔ وہ مشرق سے اپنے گھروں کو چھوڑ کر میدانوں اور صحراؤں کے کوئی ایک ہزار میل کے فاصلے کو طے کر کے، گاڑیاں ہانکتے ہوئے یہاں آئے ہیں اور انھوں نے مس سپی سے لے کر ریو گرانڈے تک اپنے مردوں کو بے گور و کفن چھوڑا ہے۔ ان میں سے ہر شخص کے سامنے ایک ہی نصب العین ہے، اس وسیع و عریض علاقے میں سر چھپانے کے لئے ایک گھر بنانا" اس کی آواز میں التجا کے ساتھ ساتھ فصاحت و بلاغت بھی آ گئی "کرنل بروٹن صاحب! اب کہ آپ یہ مقدمہ جیت چکے ہیں، میں ان بے خانماں لوگوں کے نام پر آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ اپنے علاقے میں حکومت کی لاکھوں ایکڑ میں سے چند ایکڑ پر انھیں آرام سے آباد ہونے کا موقع عطا کریں گے؟"

میں نے دیکھا کہ لوٹی کیمرن کی نقاب میں چھپی ہوئی آنکھیں اُمیدوارانہ میرے چچا کو تک رہی تھیں، لیکن چچا نے اس کی طرف نہ دیکھا۔ ان کا سر کسی پیاسے بچھڑے کی طرح اوپر اٹھا ہوا تھا جو اپنے گلّے سے بچھڑ گیا ہو اور بھیڑیوں سے بچتا بچاتا پانی کی تلاش میں پھر رہا ہو۔

انھوں نے کہا "چیمبرلین! مجھے اس شخص سے ہمدردی ہے جو یہاں آباد ہونے کے لئے سب سے پہلے آیا تھا۔ اور ریڈ انڈینوں کے خلاف اپنی اور اپنے کنبے کی جان خطرے میں ڈال دی تھی۔ اور کسی قدر انسانی ہمدردی مجھے اس شخص سے بھی ہے جس نے اس علاقے کو محفوظ اور پُر سکون دیکھ کر یہاں اپنا گھر بسانا چاہا تھا، حالانکہ اس علاقے کو محفوظ اور پُر سکون بنانے کے لئے کسی اور نے لڑائیاں لڑی تھیں۔ لیکن اس چھوٹے خاموش کمرے میں ان کی آواز گونج رہی تھی "جب وہ شخص میرے ان کھیتوں پر قبضہ جمانا چاہتا ہے جو سمندر کی سطح سے کوئی ساٹھ ہزار فٹ بلند ہیں جب وہ اپنے کنبے کی معاش کے لئے ایسی زمین پر ہل چلانا چاہتا ہے جہاں فصل تیری کے لئے بارش بھی نہیں ہوتی، جہاں وہ اس گھاس کو کاٹ ڈالتا ہے۔ جسے اُگ کر سرسبز و شاداب ہونا ہے، جہاں وہ پانی کی قلت کے باعث پیاسا مر جاتا ہے، جہاں وہ میرے بچھڑوں کو مار کر اپنے کنبے کا پیٹ بھرتا ہے، جہاں وہ ایک ایسا آدمی بن جاتا ہے جو خود اپنی عزت بھی نہیں کر سکتا۔ اور جو پورے علاقے کے لوگوں کے لئے وبالِ جان بن جاتا ہے تو ایسے شخص کے لئے میرے دل میں نہ ہمدردی ہے نہ خلوص۔"

اب اُن کی مغرور آنکھوں سے چنگاریاں برس رہی تھیں۔ ان کے چہرے

پر ملامت بلکہ بے رحم سنگ دلی طاری تھی۔ انھوں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"میں ان پر امن شہریوں کے مزاج سے بخوبی واقف ہوں جنھوں نے اس فضول شخص لوگنز پر حملہ کیا تھا۔ اور میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ ہر اس شخص کو قتل کر دینے کا ارادہ رکھتے ہیں جو ان کے علاقے کو برباد کرنے کی کوشش کرے گا۔"

تقریباً ایک منٹ تک دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ اُن میں سے ایک ذرا بڑی عمر کا، غیر مہذب سا، نہایت نڈر تھا۔ دوسرا نوجوان تھا اور غصّے میں آگ بگولا ہو رہا تھا۔

برائس چیمبرلین نے اپنی دھیمی اور غصّے میں جلی ہوئی آواز میں کہا۔ "حکامِ بالا نے مجھے ہدایت کر دی تھی کہ میں آپ کے یا آپ کے آدمیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کروں۔ ہاں انھوں نے مجھے یہ ضرور بتا دیا تھا کہ اس علاقے میں کوئی انصاف نہیں ہے۔ یہاں آپ کی مطلق العنانی چلتی ہے۔ اور آپ اپنی زمین پہ غریب لوگوں کو آباد نہ ہونے دیں گے۔"

وہ اچانک مڑا اور چلا گیا۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا تھا کہ اس کے چلے جانے سے معاملہ ختم نہیں ہوا۔ میں نے لوٹی کیمرن کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک بڑی نزاکت سے خاموش کھڑی میرے چچا کے بازو میں اپنا بازو ڈالے ہوئے تھی۔ اس کی آنکھیں ان خاموش کسانوں پر جمی ہوئی تھیں جنھوں نے نیلی دھاریوں اور سفید پٹیوں کی قمیصیں پہنی ہوئی تھیں اور جو مقدمے کی کارروائی سننے کے لئے عدالت میں جمع ہو گئے تھے۔ اور جب وہ اور میرے چچا کھانا کھانے کے لئے ہوٹل کی طرف

چلنے لگے۔ تو میں نے دیکھا کہ لوٹی نے وہ چمک دار پھول جو اس نے بڑی خوشی سے اپنے کوٹ میں لگا لیئے تھے۔ اتار کر پھینک دیئے۔

میرے ہاتھ میں ٹوپی تھی جو گرم ہو گئی تھی۔ اور جس کی گرمی سے میں جھنجلانے لگا تھا۔ میں ایکس چینج ہاؤس کی عورتوں کی نشست گاہ کے باہر کھڑا انتظار کر رہا تھا کہ دیکھئے کب مجھے اندر بلایا جاتا ہے۔ پھر مجھ میں مزید انتظار کی تاب نہ رہی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ میرے چچا بڑی کھڑکی کے سامنے بڑے وقار سے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے قریب ہی لوٹی کیمرن تھی۔ اس کا سر اوپر اٹھا ہوا تھا۔ کھدری نقاب بھی اٹھی ہوئی تھی۔ ٹوپی کے پر ایک شاندار زاویے میں لہرا رہے تھے۔ اور اس تنگ کمرے کی تاریکی کے پس منظر کے ساتھ ایک ایسی تصویر بنا رہے تھے، جسے میں کبھی فراموش نہ کر سکا۔ دھوپ کی ایک کرن لوٹی کے جسم پر پڑ رہی تھی۔ اور جج وائٹ نے لمبا سیاہ کوٹ جس کے گریبان پر ریشم کا کام کیا ہوا تھا پہن رکھا تھا۔ نامانوس نکاح نامہ پڑھتے ہوئے جج بار بار کھنکھارتا تھا۔ پڑھتے ہوئے بھی اس کے ہونٹ بھینچے رہتے تھے۔

جب لوٹی مڑی اور اس کا رخ میری طرف ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس کے رخسار بالکل سفید تھے جیسے آٹا ملا ہوا ہو۔ لیکن ڈاکٹر رائٹ کو اس بات کا خیال تک نہ آیا۔ ڈاکٹر نے اس خوشی کے موقع پر حاضر ہونے کے لیئے سارا دن شراب نہ پی تھی تاکہ یہاں ڈٹ کر پیئے۔ اس نے لوٹی کا ہاتھ تھاما اور دعا دی کہ وہ ہمیشہ خوش رہے اور ہنری میکرٹن نے، جس نے اس وقت ایک اجلی دھلی ہوئی قمیص پہن رکھی تھی جس پر تمباکو کا ایک داغ بھی نہ تھا۔ اپنی جھکی ہوئی

مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے لوٹی سے بڑی شوخی سے پوچھا۔ "آپ نے یہ شرمیلا جنگلی گھوڑا کس طرح پھانس لیا ہے؟"

وہ اور میرے چچا مجھے ڈپو تک لے گئے۔ اور اس روز میں نے لوٹی بروٹن کی جو آخری چیز دیکھی وہ یہ تھی کہ جب میری ٹرین سیٹی بجا کر آہستہ آہستہ چلنے لگی تو میری چچی اپنی جگہ پہ کھڑی ہوئی تھیں، اور وہ اپنے ایک ہاتھ سے رومال ہلا ہلا کر بڑی خوشی کے ساتھ مجھے الوداع کہہ رہی تھیں۔ اور جب رات کو ٹرین نیو میکسیکو کی تاریک پہاڑیوں میں سے گزر رہی تھی تو میں اپنی چچی کے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ جو میرے گمشدہ گھاس کے سمندر میں دیواروں سے گھرے ہوئے جزیرے میں مقیم تھی۔

۱۱ —— مجھے اس سے پہلے بھی کئی اور مقامات سے نفرت ہوئی تھی۔ لیکن اتنی نفرت کسی جگہ سے بھی نہ ہوئی تھی جتنی لیکسنگٹن کی اکیڈمی سے۔ جہاں میں اس عورت کی بدولت جس نے رومال ہلا ہلا کر بڑی خوشی سے مجھے رخصت کیا تھا۔ قید کر دیا گیا تھا۔ اکیڈمی کی دیواریں پکی اینٹ کی بنی ہوئی تھیں اور سبز چھپال تھپکی۔ اس کے باوجود ہر وقت ان کی مرمت ہوتی رہتی تھی۔ سردی اتنی زیادہ تھی کہ ویسی سردی پورے علاقہ میں کہیں نہ پڑتی تھی۔ سورج بعض اوقات ہفتوں نہ نکلتا تھا۔ اور جب نکلتا تھا تو ایک ہفتے سے زیادہ نہ چمکتا تھا۔ ایک میل چوڑے

دریائے مسوری کے دونوں کناروں کو ایک سڑک ملاتی تھی جس پر ہر وقت گرد و غبار اور عجیب قسم کی راکھ اڑتی رہتی تھی اور دریا کا پانی جم کر عجیب قسم کی پیلی برف بن جاتا تھا۔

اور جب بہار آئی پھول کھلنے لگے۔ رس ٹپکنے لگا۔ اور بھانت بھانت کے پرندے ہمارے اسکول کے گرد کھڑے ہوئے درختوں پر چہچہانے لگے اور دریائے مسوری کی برف پگھل کر میدانوں کی طرف بڑھنے لگی۔ تو میں بھی گویا اپنے چچا کے بقول رسّا تڑا کر وہاں سے بھاگا۔ اسی شام میں شہر کینسس میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میں اس شہر سے اور نئے شہر میں گھبرایا ہوا نہیں ہوں میں نے اپنی گردن خوب اکڑائی ہوئی تھی، اور کمر کو بھی سیدھا کر رکھا تھا۔ اس شہر میں پتھریلی سڑکوں پر ہر طرف چھکڑے اور گاڑیاں کھڑ کھڑاتی پھر رہی تھیں، اور کوئی شخص بھی مجھ پر توجہ نہیں دے رہا تھا جیسے میں سالٹ فورک کے پرانے قصبے کی گرد آلود گلیوں سے آیا ہوا ایک کاشت کار ہوں۔ میرے ذہن میں ہر وقت دھوپ میں چمکتی ہوئی وہ خاموش، گرد آلود گلیاں بسی رہتی تھیں، اور میں ہر لمحہ جلد از جلد ان گلیوں میں پہنچنے کی خواہش کرتا رہتا تھا۔ ان گلیوں میں گھومنے پھرنے کی اتنی شدید خواہش میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی محسوس نہ کی تھی۔ ہاں یہ خواہش آدھ گھنٹے کے بعد کچھ دب کر رہ گئی۔ جب میں مویشیوں کے باڑے میں پہنچا اور میں نے دوبارہ مویشیوں کی خوشبو سونگھی اور لمبے لمبے بل کھائے ہوئے جانے پہچانے سینگ دکھائی دیئے اور ماسٹرز پیکنگ کمپنی کے مالک نکولس ماسٹرز کی باتیں سنیں۔ باتیں کرتے کرتے جب وہ کھانستا تو اس کے رخساروں کا گوشت سرخ

جیلی کی طرح کانپنے لگتا۔ اس نے اپنی موٹی انگلی ہلاتے ہوئے کہا کہ اگر میں اسکول سے گھر بھاگ کر جانے میں تمہاری مدد کروں تو تمہارے چچا پھر کبھی میرے ہاتھ اپنے مویشی فروخت نہ کریں گے۔

لیکن جب میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ مجھے اسکول کے قید خانہ میں ڈالنے والی وہ عورت ہے جس نے میرے چچا کو شادی کی زنجیر میں جکڑ لیا ہے اور جس سے مجھے سخت نفرت ہے۔ تو اس نے کچھ سوچتے ہوئے میری طرف دیکھا جیسے ایک انسان دوسرے انسان کو غم کی حالت میں پا کر دیکھتا ہے۔ اور جب میں وہاں سے چلا تو میرے پاس ایک گزرنامہ اور کچھ روپیہ تھا۔ میں نے اس سے یہ عہد کیا تھا کہ میں کبھی اس عورت پر یہ ظاہر نہ ہونے دوں گا کہ کس نے میرے ساتھ دوستی کا سلوک کر کے مجھے گھر تک پہنچایا ہے۔

میں ایک گھوڑے پر چڑھا، جسے میں نے ڈگیٹ کے اصطبل سے لے لیا تھا، اپنے چچا کے مویشی خانے کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی پورے علاقے کی گھاس اپنے جوبن پر تھی۔ دلدلیں پانی سے بھر گئی تھیں اور ان کے کناروں پر لمبی لمبی گھاس لہرا رہی تھی۔ اور جوہڑوں میں بھی طرح طرح کی گھاس اُگ آئی تھی۔ اور آسمان سبزہ زار بنا ہوا تھا۔ موسم بہار کی آمد کی خوشی میں بچھڑے کلیلیں کرتے پھر رہے تھے۔ اور چڑیاں رقص کر رہی تھیں۔ اور نئی نئی دھوپ کی تمازت میں گھوڑوں کے سردیوں کے پلے ہوئے بال گرنے شروع ہو گئے تھے۔ ایک طرف گھاس کا یہ وسیع منظر تھا اور دوسری طرف میرے دل میں یہ تلخ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ اس ظالم عورت نے مجھے اس خوبصورت منظر سے دور کر رکھا تھا۔ اس احساس

کے ساتھ ساتھ میں ارادے باندھ رہا تھا کہ میں اس سے گفتگو بھی نہ کروں گا۔ اور بڑی رکھائی سے پیش آؤں گا۔

میں نے اس خیال سے کہ وہ مجھے آتا ہوا نہ دیکھ سکے۔ اپنے گھوڑے کا رُخ مویشی خانے کے عقبی حصّے کی طرف کر لیا۔ اور جب میں عقبی دروازے سے مویشی خانے میں داخل ہوا تو ایک عجیب سے چینی باورچی نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑا غصّہ آیا کہ وسیع ہال کمرے میں صنوبری آرام کرسیاں اور صوفے بچھے ہوئے ہیں جن پر خوبصورت رنگین چادریں پڑی ہوئی ہیں۔ بڑے گودام کے کھلے ہوئے دروازے سے یہ دیکھ کر میرے غصّے کی حد نہ رہی کہ آٹے اور کافی کی بوریاں غائب ہو چکی ہیں۔ اور خشک پھلوں کے پیپے وہاں سے اٹھ چکے ہیں۔ اب تو اس کمرے کے فرش پر برسلز کا ایک خوبصورت قالین بچھا ہوا تھا۔ کھڑکیوں پر سرخ رنگ کے بھاری پردے پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ آرام کرسیاں اور گھوڑے کے بالوں سے بھرے ہوئے صوفے تھے اور ایک کونے میں مڑی ہوئی ٹانگوں پر ایک پیانو رکھا ہوا تھا جس کے ڈھکنے پر نئی نئی پالش کی ہوئی تھی۔ بالکل ہمارے اسکول کے پیانو کی طرح۔

میری روح کو ناقابلِ بیان مایوسیوں نے گھیر لیا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ مویشی خانہ جسے میں جانتا تھا اور جس سے میں محبّت کرتا تھا ہمیشہ کے لئے اُجڑ چکا ہے۔ میں دل میں تلخی لئے وہاں تنہا کھڑا ہوا تھا کہ ایک نازک جسم نیم تاریک ہال کمرے اور پچھیلے ساتھ والے سونے کے کمرے سے گزرتا ہوا نمودار ہوا۔ اُف! وہ پہلے کی نسبت کافی دبلی ہو گئی تھی۔ لیکن اِن دُور افتادہ میدانوں میں بھی اس کے بال سینٹ لوئی کے جدید ترین فیشن میں گندھے ہوئے تھے۔ ایک گلابی رنگ کا پھول

جس کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی سبز پتیاں تھیں، اس کی انگیا کی جھالر پر بڑی خوبصورتی سے لگا ہوا تھا۔ اور اس کے چلنے کے انداز میں اب تک وہی تازگی وہی زندگی تھی۔

پھر اس نے مجھے پہچان لیا۔ "ہال!" قریب قریب اس کی چیخ نکل گئی۔ اس نے اپنے گداز نوجوان ہاتھوں سے مجھے اس طرح گدگدایا جیسے اس نے کسی زندہ شخصیت کو ہفتوں سے نہ دیکھا ہو۔ اور جب مجھے چاروں طرف سے عطریات کی نفیس خوشبو نے گھیر لیا تو میرے دل سے نفرت کا جذبہ اس برف کی طرح پگھل گیا جو ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ پہلے لیکسنگٹن میں موسم بہار آنے پر دریائے مسوری سے پگھل کر نکل گئی تھی۔

اس نے مجھے ایک ہاتھ کے فاصلے پر رکھ کر ابھی تک پکڑ رکھا تھا۔ وہ بار بار مسکراتے ہوئے مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ میرا ہاتھ بھینچ کر اور ہنس کر اس نے کہا تھا تم بڑی تیزی سے جوان ہو رہے ہو۔ پھر اس نے مجھ سے بے شمار باتیں کیں۔ یہ کہ برسوں سے کوئی شخص ان کے ہاں مہمان نہ بنا تھا۔ یہ کہ اس نے مغرب کی اس شاندار آب و ہوا میں مویشی خانے میں سردیاں بڑے آرام سے گزاری ہیں۔ یہاں کا آسمان سدا نیلا رہتا ہے۔ اور دھوپ تو جیسے ابد تک چمکتی رہے گی۔ یہ کہ میرے چچا پہلے سے کہیں زیادہ ممتاز اور باوقار معلوم ہوتے ہیں اور یہ کہ وہ مجھے وہ پودے دکھائے گی جو اس نے بہار سے کاریڈوروں سے گرمیوں کے سائے کے لئے لگوائے ہیں۔ اور یہ کام میرے چچا کے نزدیک ہمیشہ سے ذلیل تھا۔ کیونکہ گھوڑوں کی سواری کرنے والوں لوگوں کو پودے لگانا زیب نہیں دیتا۔

لیکن اس کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کے ساتھ میں نے اس کی کالی گہری آنکھوں میں وہی بے قرار چمک دیکھی جو میں نے پہلے روز دیکھی تھی۔ اور اگلے سال جب میں کچھ اور لمبا ہو کر بہار کی چھٹیوں میں گھر آیا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں وہی بے قرار چمک اب بھی موجود ہے، حالانکہ اب دیوان خانہ میں کافی لوگ بیٹھے رہتے تھے۔ اور مکھیوں کی طرح بھنبھناتے رہتے تھے۔ اور مجھے جلدی ہی یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب مہمان دوپہر یا رات کے کھانے پر موجود نہ ہوں۔ بعض مہمان تو ایک ایک ہفتہ یہاں ٹھہرتے تھے۔ اب مویشی خانہ اچھا خاصا مہمان خانہ بن گیا تھا۔ تمام مہمان یا تو قہقہے لگاتے تھے یا اونچے سُروں میں گیت گاتے تھے۔ عورتیں کاڑھتی تھیں یا کروشیے کا کام کرتی تھیں۔ تاش کھیلے جا رہے ہیں، چوسر کھلی ہوئی ہے، شطرنج بچھی ہوئی ہے۔ سب کچھ ہوتا تھا مگر یہ نہیں ہوتا تھا کہ ان مہمانوں میں سے کوئی کسی منہ زور گھوڑے پر چڑھ کر سبزہ زار کا ایک چکر لگائے۔ اس کام سے بچنے کے لئے چچی لوٹی بروٹن کے پاس بڑے خوبصورت بہانے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ ان مہمانوں میں شراب خانہ نمبر ۴۴ کے مالک کھلنڈرے انگریز تھے۔ فورٹ الونگ سے آئے ہوئے رقص کے شوقین افسر تھے، زندہ دل شکاری تھے، اور وہ بینڈر ووڈز خاندان کے افراد تھے جنھیں اس محفل میں خاص اہمیت حاصل تھی کیونکہ لوٹی بروٹن ان کے خاندانی نام اپنی مخصوص طرح دار آواز میں عجیب قسم کی لرزش پیدا کر کے ادا کیا کرتی تھی۔ سانٹا فے اور البیبوکرک سے آئے ہوئے خصوصی مہمان تھے، اور زج وائٹ اور ریاکس جیمبربین تھے، جو ڈسٹرکٹ

کورٹ کا دورہ کرنے کے لئے جب کبھی یہاں آتے تو لوئی بروٹن کے مہمان ضرور بنتے۔
اگر میں یہ توقع کرتا تھا کہ میرے چچا کو اپنی مہمان داری پر خفگی کا اظہار کرنا چاہیئے تو یہ میری غلطی تھی۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح جوش و خروش سے گھوڑے پر سوار اپنے علاقے کا دورہ کرتے تھے، اور میرا خیال ہے کہ میری طرح انھیں بھی یہ بات معجزے سے کچھ کم نہ معلوم ہوتی ہوگی کہ اندھیری رات میں وہ ایک دم اپنے جگمگاتے ہوئے مکان میں داخل ہو جاتے تھے۔ گھوڑے کی سخت گدّی پر سے اتر کر انھیں بیٹھنے کیلئے تکیہ دار آرام کرسی ملتی تھی۔ وہ ناہموار میدان کی ٹھنڈک سے نکل کر پردوں والے کمرے کی حرارت میں آجاتے تھے۔ جہاں لوئی بروٹن کے گداز بازو کندھوں تک عریاں ملتے تھے۔ اور وہ لمبے ریشمی گاؤن میں لپٹی ہوئی ہوتی تھی۔ اور اس کے چاروں طرف سفید موم بتیاں جگمگا کر کسی گرجا کا منظر پیدا کرتی تھیں اور ان کی میز کے گرد زرق برق ملبوسات کی دمک، باتوں اور قہقہوں کی گونج ہوتی تھی۔
میرے چچا اپنے وقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑے منکسرانہ انداز میں ہر کسی کے سامنے سر جھکاتے تھے۔ لیکن وہ باتیں بہت کم کرتے تھے، وہ اپنے جھرّیوں بھرے چہرے پر ایک ویران تبسم پیدا کر کے چُپ چاپ بیٹھے رہنے کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ اور جب وہ اپنی بیوی کی طرف دیکھتے یا اس کی باتیں سنتے تو ان کی گستاخ اور شوخ آنکھوں میں کچھ نرمی سی آجاتی۔ اس محفل میں اس بات کی ذرا پروا نہ کی جاتی تھی کہ کون آیا، کون گیا اور کتنی دیر ٹھہرا۔ اس محفل کی شمع لوئی بروٹن تھی۔ جو ہمیشہ جگمگاتی رہتی تھی اور کبھی نہ تھکتی تھی۔ اس کا چہرہ خوشامدانہ انداز میں اوپر اٹھا ہوا ہر کسی کی بات سننے کے لئے تیار رہتا تھا۔ اس کی باتیں موقع محل کے مطابق

بدلتی رہتی تھیں۔ اس کے باوجود اس کی اپنی زبان سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اس کا طویل قہقہہ دوسرے تمام قہقہوں کے اوپر دیر تک تیرتا رہتا تھا۔ اور جب وہ پیانو بجانے بیٹھتی تھی تو اس کی انگوٹھیوں والی پتلی پتلی انگلیاں بڑی نفاست سے پیانو کے سفید سُروں کو ہلکے سے چھوتی ہوئی گزر جاتی تھیں اور اوپر سے سنگ مرمر پیتل اور چینی کے جڑاؤ لیمپ سے ہلکی ہلکی روشنی اس کے سیاہ بالوں کو سنہری بنا دیتی تھی۔

وہ جب باتیں کرنے پر آتی تھی تو ایک لمحے کے لئے بھی توقف نہ کرتی تھی۔ اور جب میں اسے گھوڑے کے بالوں سے بھرے ہوئے کالے صوفے پر بیٹھا ہُوا یوں ہشاش بشاش اور اپنے دونوں طرف بیٹھے ہوئے مردوں کے سامنے سفید سفید ہاتھوں کو نچا نچا کر مسرّت انگیز باتیں کرتے دیکھتا تو مجھے یہ عجیب و غریب احساس ہوتا کہ یہ عورت کبھی سوتی ہی نہیں، اور اگر اسی طرح اسے اپنے ہم مزاج دوستوں کی صحبت ملتی رہے تو یہ شب و روز اسی طرح باتیں کرتی رہے گی۔

اور جب وہ بیدر ووڈ زیا ہولڈ زینس کے ہاں جو برالٹس چیمبرلین کے رشتہ دار تھے۔ ایک رات گزارنے کے لئے اپنے تیز رفتار شکاری کتوں کے ساتھ قصبے میں جاتی تھی۔ تو وہ راستے میں ایک لمحے کے لئے بھی کسی جگہ نہ ٹھہرتی تھی۔ ایک دو مرتبہ میں بھی اس کے ساتھ قصبے گیا تھا۔ اور جونہی ہم بنفشی اور گلابی پھولوں والی جھاڑی کی گھنی دیوار کو عبور کرنے لگے۔ تو اس نے مزید جوش و خروش سے اپنی باتیں شروع کر دیں، اس کا حسّاس چہرہ گھاس کے وسیع سمندر سے یوں متنفّر نظر آتا تھا جیسے وہاں طاعون پھیلا ہوا ہو۔ اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ اس عورت نے کبھی

کسی لٹیرے کو اپنی گاڑی کے ساتھ بھاگتا ہُوا یا کسی ہرن کو مویشیوں کے درمیان چلتا ہوا نہیں دیکھا ہے۔ اور مجھے یہ خیال بھی آیا تھا کہ آخر کار میں یہ راز سمجھ گیا ہوں کہ بن تیتّی اور گلابی پھولوں والی جھاڑی جو اس نے کارندوں سے بنوائی تھی۔ گرمیوں سے بچنے کی خاطر سایہ بنانے کے لیئے نہیں۔ بلکہ اپنے آپ کو گھاس کے سمندر کی لہروں سے بچانے کے لئے بنوائی تھی۔

بچے ہو جائیں گے تو وہ آپ ہی اطمینان سے گھر بیٹھ رہے گی۔ یہ فقرہ میں نے مسز ہنڈرووڈ کی زبانی سنا تھا جو اس نے ہیولمن کی شادی کے موقع پر جج وائٹ سے لوئی بروٹن کے بارے میں کہا تھا۔ لوئی نے اس روز اپنے بالوں میں ہیرے کی افشاں چھڑکی ہوئی تھی۔

۴ ـــــ اس کے بعد بچے بھی جلد جلد آنے لگے۔ میں ہر سال جب اسکول سے چھٹیوں میں گھر آتا تو مویشی خانے کے سامنے والے بڑے سونے کے کمرے میں ایک بچے کا اضافہ دیکھتا۔ پہلے ایک لڑکی تھی جو خاصی موٹی تھی۔ اس کی آنکھیں کالی تھیں اور اس کی آواز میں کچھ غرغراہٹ تھی اور اس کے سر پر بال نہ ہونے کے برابر تھے۔ دوسرا ایک لڑکا تھا جو کبھی نہ مسکراتا تھا۔ اور اس کی آنکھوں اور بالوں کا رنگ بالکل سیاہ تھا۔ تیسرا بھی ایک لڑکا تھا جس کی آنکھیں غیر متوقع طور پر چمک دار اور نیلی تھیں۔ اور اس کے بال اتنے سفید اور ملائم تھے کہ میرے سانس لینے کے ساتھ وہ ہلکے پروں کی

طرح ہلنے لگتے تھے۔

تین بچوں کی ماں ہوتے کے باوجود لوئی بروٹن میں مجھے یا کسی اور کو کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔ جب اس کی پہلی بچی گود میں تھی تو میں نے ازراہِ احترام اسے "چچی جان" کہنا چاہا تھا۔ لیکن اس نے مجھے فوراً ہی منع کر دیا تھا۔

"ہاں! خبردار مجھے چچی وچی نہ کہنا" یہ کہتے وقت اس کی سیاہ آنکھیں حسبِ معمول چمک رہی تھیں "میں کبھی اتنی بوڑھی نہیں ہوں گی کہ کسی کی چچی کہلاؤں"

بلیک ہیتی جو بچوں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی، اس بات پر ہنس پڑی اور اس کے چوڑے سفید دانت نظر آنے لگے۔ دوسرے بچے کی ولادت کے بعد بھی لوئی بروٹن اسی طرح نازک، زندہ دل، خوش مزاج اور جذباتی عورت تھی۔ اس کی گداز سفید جلد پر ایک جھری تک نہ پڑی تھی۔ اور تیسرا بچہ گود ہی میں تھا اور ابھی ماں کا دودھ پیتا تھا کہ لوئی انگریزوں کے شراب خانہ نمبر ۴۴ کے بڑے ہال میں چار اشخاص کی جوڑی والے دس ناچ میں سے آٹھ ناچ ناچی تھی۔ اور دو دو آدمیوں کی جوڑی والے رقص میں بھی وہ برابر شریک رہی تھی۔ اور ہر بار اس کا رفیق براٹس چیمبرلین ہی ہوتا تھا۔

اب براٹس اکثر میرے چچا کے مویشی خانے میں آنے لگا تھا اور اس کا آنا میرے لئے خاصی دلچسپی کا سامان پیدا کر دیتا تھا۔ ہر بار اس کے ساتھ اس کی خالہ زاد بہن نوجوان مسز ہولڈرنیس بھی آتی تھی۔ جو ذرا اِترا کر چلتی تھی اور جس کے بال سنہری اور آنکھیں نیلی تھیں۔ میرے چچا موجود ہوں یا نہ ہوں براٹس ضرور آتا تھا۔ واشنگٹن میں وزارت میں خاصی تبدیلیاں آگئی تھیں اور نتیجہ یہ ہوا تھا کہ

برائس اور رچ وائٹ کے بھی تبادلے ہو گئے تھے۔ برائس چیمبرلین نے گڈ نگ کی رقص گاہ کے نزدیک ہی گرد آلود پلازا کی دوسری منزل میں اپنا قانونی دفتر کھول لیا تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ وہ زمین کے بڑے بڑے قطعات کے حقِ ملکیت کے بارے میں فیصلے صادر کیا کرتا تھا اور داخل خارج کا کام بڑے جوش و خروش سے کرتا تھا۔

میرے چچا اس سے کوئی غرض نہ رکھتے تھے۔ اور نہ کوئی توجہ ہی دیتے تھے۔ مگر برائس اپنے پُرخلوص برتاؤ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا۔ لیکن میں نے کئی بار اس بات کا مشاہدہ کیا کہ جب میرے چچا اپنے خیالوں میں گم کسی اور طرف دیکھ رہے ہوتے تو برائس چیمبرلین کی نیلی آنکھیں میرے چچا کا سرتاپا جائزہ لیتیں۔ جیسے یہ کہہ رہی ہوں کہ تم اگلے وقتوں کے لوگ ہو، تمہیں اب جلد مر جانا چاہیئے۔ تمہارا وقت گزر گیا ہے۔ اب ہمارا وقت ہے۔ اب دنیا کا کاروبار تم نہیں ہم چلائیں گے۔"

اور لوٹی سے تو وہ کھلم کھلا کہا کرتا تھا "مغرب میں تہذیب بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ اور وہ دن اب ہمارے ہاں بھی آنے والی ہے۔ تہذیب کے آتے ہی اس مویشی خانے کے چاروں طرف کے زرخیز میدانوں میں جگہ جگہ کنویں، کھیت اور مدرسے نظر آئیں گے۔"

میرے چچا اس طرف کوئی توجہ نہ دیتے تھے، اس لئے میں بھی نہ دیتا تھا لیکن ایک دفعہ جب میں اُس کے ہاں شام کے کھانے کا دعوت نامہ لے کر گیا، تو میں نے دیکھا کہ اس کی میز پر عمارتوں کے نیلے نقشوں، طرزِ تعمیر کے نمونوں اور

زمین کے بھوکے آباد کاروں کے سینکڑوں خطوط کا ایک انبار لگا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت غصّہ آیا اور میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔

واشنگٹن کی وزارت میں ایک بار جب پھر تبدیلی ہوئی تو ان دنوں میں سینٹ لوئی کے کالج میں پڑھتا تھا۔ میں سالٹ فورک گھر کے لئے روانہ ہونے ہی والا تھا کہ قصبے سے شائع ہونے والے ایک اخبار میں، جو انگریزی اور ہسپانوی زبان میں بیک وقت شائع ہوتا تھا، میں نے یہ خبر پڑھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ برائس چیمبرلین اپنا سالٹ فورک کا دفتر بند کر رہا ہے، اور اس کی جگہ وکیل آر کی میڈ آ گیا ہے۔ برائس اب اپنی رہائش ڈن ور میں رکھے گا جہاں بعد میں اسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ڈسٹرکٹ اٹارنی مقرر کیا جائے گا۔

اور دو ہفتوں کے بعد جب میں گھر آیا اور برائس کو اب تک سالٹ فورک ہی میں پایا تو مجھے بڑا غصّہ آیا۔ پہلی مرتبہ جب میں نے اسے دیکھا تھا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گرد پلازا کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے مشرقی وضع کا اجلا سوٹ پہن رکھا تھا جس کے سارے بٹن بند تھے۔ اور سر پر مغربی طرز کا ہیٹ تھا جس کے حاشیے پر دو پہلی گوٹ لگی ہوئی تھی۔

میرے قریب ہی ہنری میکمرٹن کھڑا ہوا تھا جو پہلے کی نسبت زیادہ موٹا اور سست ہو گیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی جھکی ہوئی مونچھیں اور زیادہ سفید ہو گئی تھیں۔ اور وہ وہاں کھڑا ہوا کچھ سوچتا ہوا اپنی گہری دھنسی ہوئی آنکھوں سے برائس کو جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا " اس کے جانے پر کیا آپ

بھی خوش ہیں ؟ "

" ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پتا نہیں وہ جائے گا بھی یا نہیں۔ قصبے میں طرح طرح کی افواہیں اڑ رہی ہیں " اُس نے کہا۔ پھر گویا اُسے اچانک یہ احساس ہوا کہ اس نے مجھے کچھ زیادہ باتیں بتا دی ہیں، شاید اسی لئے وہ فوراً مڑ کر چلا گیا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ مجھ میں اُن باتوں کو محسوس کرنے کا شعور پیدا ہوا جو اب تک نہیں آتیں۔ ریتلی پہاڑیوں سے ریت ہوا کے ساتھ اڑ کر قصبے کی طرف آ رہی تھی اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا گویا کوئی طوفان آنے والا ہے۔ کوئی بہت ہی منحوس اور خطرناک بات ہونے والی ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ چوراہا جہاں سے چاروں طرف جانے والی پگڈنڈیاں پھٹتی تھیں مشرق کی درجنوں بندرگاہوں سے آنے والے آباد کاروں کا ملجا و ماوا بنا ہوا تھا۔ آبادی کے ان متلاشیوں کی گاڑیوں پر سفید موٹی چادریں تنی ہوئی تھیں۔ مجھے فوراً یاد آگیا کہ ان گاڑیوں کو تو میں نے کل ہی دیکھا تھا جب میں ٹرین کی کھڑکی میں بیٹھا ہوا باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پہلے انھیں کینساس کے پاس سے گزرتا ہوا دیکھا تھا، پھر انھیں ریٹن کو عبور کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ دور دور تک پگڈنڈیوں پر ان آباد کاروں کا قافلہ چلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

اور جب میں اگلے روز مویشی خانہ میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ لوٹی بروٹن پہلے سے کہیں زیادہ ہشاش بشاش تھی۔ اس کے رخسار گلاب کے پھول کی طرح سرخ ہو گئے تھے۔ آنکھیں کچھ زیادہ ہی بے چین اور اداس اداس لگ رہی تھیں۔ اور کبھی کبھی تو ان کا عکس میری آنکھوں کو چکا چوند کر دیتا تھا۔ ساری سہ پہر اس کی زبان

سے مسرتوں اور سرخوشیوں کا دھارا بہتا رہا تھا۔ ابھی وہ ایک بہن کی طرح بے تکلف تھی اور اس کی باتوں سے محبت ٹپکی پڑتی تھی اور ابھی وہ چنچل محبوبہ کی طرح چٹکیاں بھر رہی ہے۔ گدگدیاں کر رہی ہے۔ اور میرے ننھے ننھے چچا زاد بھائی بہن میری کرسی کے نیچے گھسے ہوئے ہیں کبھی میرے کندھوں پر چڑھتے ہیں، کبھی بال نوچنے لگتے ہیں۔ کبھی میری نئی چاندی کی گھڑی اور زنجیر چھین کر پہننے لگتے ہیں۔

لوٹی ہر روز اپنے بچوں کے ساتھ ایک ایسی شفیق اور مہربان خاتون کا سا سلوک کرتی تھی جس نے ان کی دینی ماں بننا قبول کر لیا ہو۔ لیکن آج رات جب اس نے بلیک بیٹی سے یہ کہا کہ وہ بچوں کو خود سلائے گی جو مجھے تھوڑی سی حیرانی ہوئی۔ میں چوکھٹ سے لگا خاموش کھڑا ہو گیا۔ لوٹی اپنے بچوں سے مذاق کر رہی تھی۔ وہ جمی کے گدگدی کر رہی تھی جس کی ٹانگوں اور ہاتھوں پر چھائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے سارہ بٹ کی چست صدری کو پکڑ کر کہا، یہ تو بالکل ولایتی انگیا معلوم ہوتی ہے۔ یہ سن کر بیٹی بہت شرما گئی۔ پھر اس نے براک کی سفید شفاف جلد پر ہاتھ پھیرتے ہوئے قدرے مسکرا کر کہا۔ خدا نے تجھے لڑکی بنانا چاہا تھا مگر تو لڑکا بن گیا۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے اس کے نرم سفید ہاتھ برابر اُن کے کپڑے اتار رہے تھے۔ اور انھیں ململ کے ڈھیلے ڈھالے سونے کے کپڑے پہنا رہے تھے۔ جب بچے اپنے اپنے بستروں پر جا لیٹے تو ململ کے کپڑوں سے ان کے ٹخنے تک چھپ گئے تھے۔

اور جب ہم دونوں واپس اپنے کمرے میں آئے تو جوش میں کانپ رہی تھی۔ میں اُسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ زخمی شیرنی کی طرح مڑی

اور کہنے لگی "ہاں! تم مجھے ایسی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہو؟ کیا میں بوڑھی ہو گئی ہوں؟ کیا میرا رنگ پیلا ہو گیا ہے؟ آخر تم کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا میری آنکھوں کے نیچے گڑھے پڑ گئے ہیں؟"

میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا کہ میں تو کچھ بھی نہیں دیکھ رہا ہوں۔ ہاں یہ بات میں نے سچ سچ اسے بتا دی کہ میں نے پہلے روز جب اسے ساؤتھ فورک کے ڈپو پر دیکھا تھا، اس وقت سے اب تک اس میں بڑھاپے کی کوئی نشانی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ وہ پہلے روز کی طرح حسین اور جوان ہے۔ دوسرے ہی لمحے وہ پھر پھول کی طرح کھل اٹھی۔ طبیعت کی جولانی عود کر آئی۔ اور وہی زندہ دل شخصیت پھر جاگ اٹھی۔ لیکن ساری رات مجھے سامنے والے بڑے سونے کے کمرے میں کسی کے چلنے کی آوازیں آتی رہیں اور دوسرے دن جب سرخ سورج سبزہ زار کے ایک کونے میں طلوع ہوا اور میں بیدار ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ وجود جو ساری رات جاگتا رہا تھا اب تک اپنے کمرے میں بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔

ناشتے اور دوپہر کے کھانے کے چند منٹوں کے سوا وہ مجھے سارے دن نظر نہ آئی۔ میں اپنی عادت کے مطابق گھوڑے پر بیٹھ کر سبزہ زار کا ایک چکر لگانا چاہتا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی ایک عجیب و غریب بالکل نئی چیز نے مجھے اس ارادے سے باز رکھا۔ ساری سہ پہر میں سنتا رہا کہ وہ اپنے کمرے میں عجب پُر اسرار انداز میں ٹہل رہی ہے۔ چھ بجے کے قریب میں گھوڑے کے بالوں سے بھرے ہوئے پھسلواں صوفے پر لیٹا ہوا صنوبری

چھت کو تک رہا تھا کہ مجھے ہال کمرے میں سے گزرنے والے سایہ کی سرسراہٹ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ بالکل میرے قریب آ گئی تھی۔

اس نے آتے ہی کہا "دیکھو ہال! اب تم بچے نہیں رہے۔ پورے مرد بن چکے ہو۔ تم عرصے تک سینٹ لوئی اور شہر کینسس میں رہے ہو تم دنیا کے طور طریقے جان گئے ہو۔ اور میں سمجھتی ہوں جب میں تم سے یہ کہوں کہ میں یہاں سے ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں تو تم سمجھ جاؤ گے "۔

میں نے اسی طرح لیٹے لیٹے اپنی آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے سانس لئے بغیر کہا۔ " ہاں! تم کہو گے وہ بھاگ گئی۔ لوگ اسے بھاگنا ہی کہتے ہیں۔ ہاں میں بھاگ رہی ہوں۔ اور تمہارے چچا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہی ہوں۔ میں کل صبح یہاں سے چلی جاؤں گی اور پھر کبھی نہیں آؤں گی "۔

میں پتھر کی طرح منجمد بیٹھا تھا۔ میں نے یہ اکثر سنا تھا کہ عورتیں اپنے شوہروں کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ بھاگ جایا کرتی ہیں۔ لیکن یہ بات کہ لوٹی بروش میرے چچا کو چھوڑ رہی ہے جب کہ اُسے اس مویشی خانہ کے عیش پسندانہ ماحول میں اعلیٰ ترین مقام حاصل ہے۔ میرے لئے ناقابل تصور تھی۔ مجھے یاد آیا کہ چچا تو علاقے کے لمبے دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ جو بہار کے آغاز کے ساتھ شروع ہوتا تھا اور گرمیوں کے آغاز پر ختم ہوتا تھا۔ لوٹی نے یقیناً میرے یہ خیالات میری آنکھوں میں پڑھ لئے ہوں گے۔

چنانچہ اس نے مجھ سے کہا" ہاں! میں ان کی پیٹھ پیچھے نہیں بھاگ رہی ہوں۔ میں نے کوئی ایک مہینہ پہلے اُن سے کہہ دیا تھا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب آبادکاروں کا پہلا گروہ سالٹ فورک آیا تھا۔ میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں مزید ایک سال یہ برداشت نہیں کرسکتی۔ یعنی تمہارے کاربدوں کا غریب آبادکاروں کو لوٹنا اور قتل کرنا۔ جیسا کہ انھوں نے لوئی زیاناکے اس غریب کاشت کار کو قتل کردیا تھا۔ وہ تو یونہی ایک فضول سا آدمی تھا، مگر ہاں، ذرا سوچو تو، اس کی بیوی تھی چھ سات بچے تھے۔ اور اب جہاں تک میرا تعلق ہے، یہ سب کچھ طے پاچکا ہے۔ میرا فیصلہ اٹل ہے۔"

"لیکن جمی اور ریرک اور سارہ کہاں جائیں گے؟" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر میں نے پہلی بار درشتی کے آثار دیکھے۔ کہنے لگی" ہاں! میں نے بچوں کے مسئلے پر تمہارے چچا سے کئی بار گفتگو کی ہے۔ میرا خیال ہے ہزاروں مرتبہ۔ تم تو اپنے چچا کو جانتے ہی ہو۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ بچوں کو روک کر بھی مجھے روک سکیں گے۔ لیکن دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی۔ میں نے اپنے وکیل سے مشورہ لیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں بچوں کو اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتی۔ لیکن طلاق کے بعد کوئی عدالت حتیٰ کہ میکسیکو کی عدالت بھی نہیں بچوں کو اُن کی ماں سے جُدا نہیں کرسکتی۔"

اس کی باتوں سے اندازہ ہوا، کوئی ایسی اَن کہی بات چھپی ہوئی تھی۔ جس سے میں پریشان ہوگیا۔

میری زبان سے بڑی دکھائی سے یہ جملہ خود بخود نکل گیا "کیا آپ کسی کے ساتھ جا رہی ہیں؟"

اس کے قدرے مرجھاتے ہوئے رخساروں میں غیر متوقع طور پر گہرے شوخ رنگ کی ایک سرخ لہر دوڑ گئی۔ اور وہ پنکھڑیوں کی طرح کھل اٹھے۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ پھر اس پھول کی طرح تھی جو زرخیز گیلی مٹی میں اگا ہوا ہو۔ اس کی رگ رگ سے وہ ناقابلِ فہم قوت پھوٹی پڑتی تھی۔ جسے ہم سب زندگی کہتے ہیں۔

"اگر یہ بات مجھے پہلے معلوم نہیں تھی تو اب معلوم ہو گئی ہے کہ تمہاری رگوں میں بھی وہی خون ہے جو تمہارے چچا کی رگوں میں ہے۔ تم بھی بالکل ویسے ہی سوال کرتے ہو جو تمہارے چچا کرتے ہیں، لیکن میں جس طرح انھیں کوئی جواب نہ دیتی تھی۔ اسی طرح تمہیں بھی نہ دوں گی، وہ دیکھو تمہارے چچا آرہے ہیں۔ ہاں! خدارا یہاں سے جانا نہیں۔" میں اس کی یہ باتیں سن کر غصے میں آکر اٹھنے لگا تھا کہ اس نے التجائیہ انداز میں مجھے بیٹھنے کو کہا۔ پھر اس کی نازک انگلیوں نے میرا بازو پکڑ لیا "تم یہاں رہو گے تو ہم تمہارے وسیلے سے کوئی بات کریں گے ورنہ خاموشی کبھی نہ ٹوٹے گی۔ اور پیارے خوف زدہ نظر نہ آؤ۔" اس کے چہرے پر ایک عجیب و غریب اجالا پھیل گیا "تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ میں مری نہیں ہوں مجھے کفن نہیں پہنایا جا رہا۔ ہاں! میں زندہ ہوں اور وہاں جا رہی ہوں جہاں زندگی ہے۔ میں رقص گاہوں تھیٹروں سایہ دار گلیوں اور جدید ترین دکانوں کی دنیا میں جا رہی ہوں جہاں ہر روز لوگ

گاڑیوں میں بیٹھ کر باغوں اور پارکوں کی سیر کو نکلتے ہیں۔"

اب مجھے بھی گھوڑے کے سموں کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے مڑ کر بڑی کھڑکی میں سے دیکھا کہ چچا اپنے گھوڑے پر چڑھے مویشی خانہ کی طرف ہی آ رہے تھے۔ گدی پر وہ اپنے مخصوص انداز میں سیدھے بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کا دایاں ہاتھ پہلو میں لٹکا ہوا تھا اور انگوٹھا کاٹھی کے پچھلے حصے پر رکھا ہوا تھا۔ جنگ کے زمانہ میں بھی وہ گھوڑے پر اسی انداز سے بیٹھا کرتے تھے۔ یہ انداز ان کی عادت بن چکا تھا اور اب تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اُن کے جوتوں کی آواز ہال میں سے گزرتی ہوئی ہمارے کمرے میں داخل ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بہت پریشان ہوں گے۔ لیکن میں نے آج سے پہلے انھیں اتنا مطمئن کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔

لوئی بروٹن نے انھیں بوسہ دینے کے لئے ہمیشہ کی طرح اپنا چہرہ اوپر اٹھا لیا۔ پھر اس نے ہنس ہنس کر میرے کالج کے اُن واقعات کا ذکر چھیڑ دیا جو میں نے اُسے بتائے تھے۔ چچا نے مجھ سے مصافحہ کیا اور نکولس ماسٹرز کے متعلق پوچھا کہ وہ آیا تھا یا نہیں۔ جیسا کہ اس نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا، کسی کو وقت کا ذرا بھی احساس نہ تھا، معلوم ہوتا تھا کہ کسی کو کوئی جلدی نہیں ہے، جیسے کچھ بھی نہیں ہوا ہے اور نہ کچھ ہوگا۔ معاً مجھے یہ خیال آیا کہ لوئی نے کہیں جھوٹ تو نہیں بولا تھا۔ میں نے بڑے غور سے لوئی کی طرف دیکھا۔

"مسز بروٹن! کھانا میز پر لگا دیا گیا ہے۔" چیف کیبلڈر نے اچانک آکر

جلدی جلدی کھا۔ چینی باورچی کے چلے جانے کے بعد ہمارے اس گاڑی بان نے باورچی خانہ کا انتظام سنبھال لیا تھا۔

میں نے اس رات کھانے کے کمرے میں جانے سے بہت گریز کیا۔ آخر کار جانا پڑا۔ میرے چچا بڑی متانت سے کھانا کھا رہے تھے اور صرف لوئی بروٹن زبردستی کی خوشی اپنے اوپر طاری کرکے باتیں کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ ہر لمحہ اپنی نظروں کو کھڑکیوں کے باہر جانے سے روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔

آج بھی حسب معمول بچوں نے کھانا سر شام ہی کھا لیا تھا اور اب وہ بوڑھی گھوڑی چیری کی ننگی پیٹھ پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جس کا قد ٹٹو سے زیادہ نہ تھا۔ بلیک ہیٹی ان کے پاس کھڑی ہوئی انہیں گھوڑی پر چڑھنے میں مدد دے رہی تھی۔ جمی سب سے آگے بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے چھ سات برس کی سارہ تھی۔ سب سے پیچھے ہرک تھا۔ تینوں نے لگام کا اپنا اپنا حصہ پکڑ رکھا تھا۔ ٹاٹ کا ایک تھیلا شریف بوڑھی گھوڑی کی آنکھوں پر باندھ دیا گیا تھا جس کے سموں پر لعل نہیں جڑے ہوئے تھے۔ گھوڑی بالکل خاموش کھڑی تھی۔ دفعتہً جمی نے زور سے لگام کھینچ کر اور چلا کر اسے بڑھایا۔ گھوڑی جیسے دوبارہ زندہ ہو گئی۔ اور اچھلنے کودنے لگی۔ بچے کھلکھلاتے ہوئے یکے بعد دیگرے گھاس پر ایک دوسرے کے اوپر گر پڑے۔

آج رات میں بچوں کے ساتھ نہ کھیل سکا تھا۔ میں دل ہی دل میں سوچ

رہا تھا کہ رات کا اندھیرا چھاتے ہی مجھے گھوڑے پر بیٹھ کر کپاس کے کھیتوں میں پڑے ہوئے کیمپ میں چلا جانا چاہیئے۔ اور مجھے وہاں اس وقت تک رہنا چاہیئے جب تک سارا ڈراما ختم نہ ہو جائے۔ میں ابھی کوئی فیصلہ بھی نہ کر پایا تھا کہ لوٹی بروڈٹن نے اٹھنے سے ذرا پہلے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جن کا مفہوم میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔

اس نے مجھ سے پوچھا "ہال! کیا تم مجھے کل صبح سالٹ فورک اسٹیشن تک چھوڑ آؤ گے؟"

میرے چچا اپنی کرسی پر خاموش بیٹھے ہوئے اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ لوٹی اٹھنے کا اشارہ کرے تو اٹھوں۔ بہ تعظیم، وہ اپنے چہرے پر ملائمت پیدا کرتے ہوئے ہمیشہ اختیار کرتے تھے۔ اب اُن کا سر اور چہرہ اس منہ زور گھوڑے کی طرح اوپر اٹھا ہوا تھا جیسے کسی سخت دشمن نے للکارا ہو، ان کی آنکھوں میں عزم اور قوت کی چنگاریاں اچانک چمکنے لگی تھیں۔

"ہال تمہارا ٹرنک لے جائے گا" انھوں نے فخریہ لہجے میں کہا "تمہیں ٹرین تک میں خود چھوڑ آؤں گا"

"شکریہ کرنل بروڈٹن صاحب!"

لیکن اگلے ہی لمحے جب وہ "شکریہ" ادا کر کے اٹھی تو میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر خلافِ معمول زردی پھیلی ہوئی ہے۔ اور جب چند لمحوں کے بعد میں گیلری تک جانے کے لئے ہال کمرے میں سے گزرا تو وہ بڑے سونے کے کمرے میں ہاتھی دانت کے ان دستوں کی طرف پیٹھ کئے بڑی مستقل مزاجی

سے سیدھی کھڑی ہوئی تھی جن میں چمڑے کی ایک پستول والی پیٹی جکڑی ہوئی تھی۔ جسے برسوں کے پسینے نے میلا کر دیا تھا۔ اور جواب بچوں کی پہنچ سے بہت اوپر گھوڑے کی پیتل کی کاٹھی کے ساتھ کھونٹی پر لٹکی ہوئی تھی۔

۵ ـــــ اس رات میں کافی دیر تک اس تخت پر پڑا جاگتا رہا، جو کبھی میرے چچا کا ہوتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مجھے دور سے ایک بچھیا کی آواز سنائی دیتی جو اپنی ماں کے لئے چیخ رہی تھی۔ سوتے میں میں نے یہ خواب دیکھا کہ کوئی بہت ہی خوبصورت چیز اس مویشی خانے سے چلی گئی ہے۔ جیسے زندگی کا اصل جوہر جا چکا ہے اور صرف چھلکا باقی رہ گیا ہے، کچی اینٹ کی بھوری دیواریں کھڑی رہ گئی ہیں۔ اور ان کے مکین کہیں اور چلے گئے ہیں۔ میں نے خواب میں یہ بھی دیکھا کہ مکان کے چاروں طرف زور سے آندھیاں چل رہی ہیں۔ چھپکلیوں اور بھیڑیوں کے نقوش پا ریت کے نیچے چھپ گئے ہیں۔ پھلواریاں تباہ ہو چکی ہیں اور زمین پر گر کر برف کی طرح منجمد ہو چکی ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ پوری کائنات زور سے گھوم رہی ہے۔ اور ایک بے چین کالا بھوت ان دیہاتی بھری بھری، شہوت بھری چھاتیوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہے جو خود عورت ذات کی طرح زرخیز تھیں

اور جن سے دودھ اور جنگلی شہد ٹپکا کرتا تھا۔

صبح کی پہلی آواز کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اٹھتے ہی چپکے چپکے اندھیرے ہی میں کپڑے تبدیل کئے اور اس خیال سے کہ ناشتے کی میز پر نہ جانا پڑے۔ باورچی خانہ ہی میں جاکر قہوہ پیا۔ دراصل میں صبح کی ہلکی ہلکی تاروں بھری روشنی میں اُن کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا۔ جب میں دوبارہ تاریک ہال کمرے کی طرف آیا تو دیکھا کہ ساتھ والے کمرے میں موم بتی جل رہی ہے اور لوٹی بروٹن کپڑے پہنے، ہیٹ اوڑھے، ایک ہاتھ میں دستانہ پہنے اپنے تینوں بچوں کے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔ جو ابھی تک اپنے سونے کے کپڑوں میں ملبوس گہری نیند سو رہے تھے اور وہ سوتے ہوئے بچوں سے اپنی واضح، دلکش اور مسرت انگیز آواز سے وعدہ کررہی ہے کہ وہ بہت جلد انھیں اپنے پاس بلا لے گی اور ہر ایک کے لئے دو دو تحفے بھیجے گی۔

اس کا ٹرنک گاڑی کے اندر چڑھانے میں بوڑھے جیف نے میری مدد کی۔ یہ ٹرنک مجھے اسٹیشن تک لے جانا تھا۔ تھوڑی دیر بعد لوٹی بروٹن آگئی۔ ہلکی دھیمی روشنی میں اس کا نازک جسم اور اس کی زندہ دلی اور بھی اچھی لگ رہی تھی۔ جب میرے چچا نے اُسے بڑی بگھی میں سوار کیا تو اس نے ایک بار پھر بچوں کو الوداع کہا۔ گھوڑوں کے چلنے سے پہلے ایک مرتبہ اور اس نے بچوں کو الوداع کہا۔ اور چشمے سے پرے، کہیں افق میں ڈوبی ہوئی اس کی آواز میں نے آخری مرتبہ سنی جو گھوڑوں کی ٹاپ اور پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ کے باوجود بالکل واضح اور صاف تھی۔ اور دیر تک میرے کانوں میں ایک میٹھا رس گھلا رہا اور گھنٹیاں

سی بجتی رہیں۔

بوڑھا جیف گاڑی کے پہیے کے پاس بالکل خاموش کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ جب بگھی کی آوازیں رات کی ہوا میں تحلیل ہوگئیں تو اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بڑی تندی سے اپنا پائپ نکال کر پینے لگا۔ اس نے اب بھی کوئی لفظ زبان سے نہ نکالا۔ اور بے حد اداسی کے ساتھ گھر میں چلا گیا۔ میں گاڑی پر چڑھا اور لگام ہاتھ میں تھامی ہی تھی کہ گھوڑے خود بخود اس راستے پر ہو لیے جس پر چند منٹ پہلے چچا کے گھوڑے گئے تھے۔

جنوب مغربی علاقہ میں آنے والے ایک نئے آدمی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام دن ایک جیسے ہوتے ہیں، وہی نیلا آسمان، وہی کبھی نہ بدلنے والی دھوپ، وہی کبھی ختم نہ ہونے والی گرمی جو میدان سے بخارات کی طرح اٹھتی ہے۔ لیکن اگر وہ یہاں ایک سال رہے تو وہ یہاں کے موسم کی ان نزاکتوں کو خود بخود پہچاننے لگے گا جو اس نئے آسمان کے نیچے زمین کے کسی اور قطعہ میں کبھی نہ دیکھی ہوں گی۔ بعض اوقات دن بھر مطلع بالکل صاف رہتا ہے۔ لیکن رات کو اچانک بارش یا بادلوں کے آثار کے بغیر ایک عجیب وغریب صحرائی ابر آسمان پر چھا جاتا ہے۔ اور آندھیاں چلنے لگتی ہیں۔ اور اگلے دن ہوا پہلے دن کی نسبت زیادہ صاف ہو جاتی ہے جیسے آندھی اور بارش نے مل جل کر اس کی تمام کثافتوں کو دھو دیا ہو۔ اور دنیا میں نئے سرے سے تازہ اور شفاف بنا کر بھیجا ہو۔

ایک ایسی ہی صبح میں لوئی برڈٹن کا ٹرنک تازہ اور شفاف ہوا کے نرم نرم

جھونکے کھاتا ہوا اسالٹ فورک کے اسٹیشن پر لے جا رہا تھا۔ گاڑی پہلے تو صبح کے جھولتے ہوئے چاند کی روشنی میں چلتی رہی۔ پھر ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں اور پھر اس سرخ دمکتی ہوئی روشنی میں جو پورے سبزہ زار پر شراب کی طرح چھائی ہوئی تھی جس کا مزا میں اپنے ہر سانس کے ساتھ چکھ رہا تھا۔ حتیٰ کہ پگڈنڈی کے آس پاس چرنے والے عجیب مویشی بھی اپنا اپنا منہ اٹھا کر سورج کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور جب سورج نے اپنی روشنی سے پوری زمین کو منور کر دیا اور مجھے ایک ایک چیز صاف نظر آنے لگی۔ تو میں نے دیکھا کہ سامنے سے ہرنوں کی ایک ڈار گاڑی کی طرف آ رہی ہے، دور سے ہرن ننھے ننھے نقطے سے نظر آ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھاس میں کہیں کہیں پھپھوندی لگی ہوئی ہے۔ ہرنوں کی ڈار کبھی گھاس کی دیواروں کے پیچھے چھپ جاتی، کبھی یکایک نمودار ہو جاتی۔ پھر وہ گاڑی سے ڈر کر بالکل ہی روپوش ہو گئے۔ پھر اچانک سفید سفید ہزاروں چڑیاں نظر آئیں جو گھاس کے سمندر پر اس طرح چکر لگا رہی تھیں جیسے یہیں کوئی دکھائی نہ دینے والا بادبان ہے جس پر وہ بیٹھنا چاہتی ہیں۔

پھلواریوں کے پاس سے گزرتے وقت میں ہر لمحہ یہی خواہش کرتا رہا کہ ہاتھ بڑھا کر ایک خوشبودار پھول توڑ لوں۔ لیکن لوٹی بروٹن کے ٹرنک سے اٹھتی ہوئی طرح طرح کی خوشبویات نے میری یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔ اور اب مجھے صرف یہ نظر آ رہا تھا کہ دور کالے دھوئیں کی ایک لکیر آسمان کی طرف اٹھتی ہوئی غائب ہو رہی ہے۔ اس صاف شفاف ہوا کے پورے پس منظر

میں صرف وہ لکیر ایک داغ بنی ہوئی تھی۔ اور اب دھوئیں کی اس لکیر کا سایہ ہماری گاڑی کے آگے آگے پڑ رہا تھا۔

جب ہماری گاڑی ریتلی پہاڑیوں کے قریب پہنچی تو اس وقت دھوپ میری گردن کو بُری طرح جھلسانے لگی تھی۔ میں نے دیکھا کہ پہاڑیوں کے نیچے دریا کی وادی میں کپاس بڑے آرام سے چھاؤں میں کھڑی لہلہا رہی ہے۔ میرے تھکے ہوئے گھوڑوں نے لمبی گلی کے پتھریلے فرش کو جلدی ہی طے کر لیا۔ سُرخ چہرے والا اسٹیشن ایجنٹ لوئی بروٹن کے ٹرنک کو ہماری گاڑی سے اتروانے اور چھوٹے پہیوں والی فولادی ٹرالی میں بہ احتیاط چڑھانے کے لئے بہ نفس نفیس اپنے دفتر سے آیا تھا۔

مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اسٹیشن کے آس پاس کی ہر چیز اپنے معمول پر ہے۔ مسافر انتظار گاہ کے کھلے ہوئے دروازہ سے گزر رہے ہیں چند لفنگے تختوں والے پلیٹ فارم کے بیچ میں چوکڑی مارے تاش کھیل رہے ہیں۔ اور پٹڑی کے پاس لوئی بروٹن کے چند قریبی دوست اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے ہیں۔ قہقہے لگا رہے ہیں، خوش ہو رہے ہیں اور چاہ رہے ہیں خدا کرے سینٹ لوئی کا یہ دورہ بہت خوشگوار رہے۔ اور وعدہ کر رہے ہیں کہ اس کی واپسی پہ زیادہ اچھے دن آئیں گے۔ اور زیادہ خوشیاں منائی جائیں گی۔ ادھر میں ریل کے سلیپروں سے اٹھتی ہوئی بدبو کو سونگھ رہا تھا جو دھوپ میں تھوڑی دیر تپنے کی وجہ سے تیل ملے بخارات چھوڑنے لگے تھے۔ ریل کے ایک ڈبے سے بھیڑوں کے ممنانے کی آوازیں

آرہی تھیں جنھیں دوسرے شہروں میں ذبح کرنے کے لئے بھیجا جا رہا تھا۔ ذرا پرے ایک ڈبہ سے آٹے کی بوریاں اتاری جا رہی تھیں۔ آٹے کے ذرات ہوا میں شامل ہوکر مجھ تک آ رہے تھے۔

پھر میں نے دیکھا کہ دونوں وکیل ہنری میکرٹن اور آرکی مینڈ سامان لے جانے والے ڈبہ سے پرے کھڑے ہوئے چپکے سے سنجیدہ آواز میں باتیں کر رہے ہیں۔ ان کا باتیں کرنے کا یہ انداز دیکھتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ میں نے دوسری طرف مڑ کر دیکھا، تو مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ وہ لفنگے جو پلیٹ فارم پر تاش کھیل رہے ہیں۔ چوری چوری کنکھیوں سے کچھ دیکھتے بھی جاتے ہیں۔

اور اب تک مجھے یہ یقین ہو چکا تھا کہ وہ تمام ہشاش بشاش دوست قصداً اپنے آپ پر ظلم کرکے محض اداکاری کر رہے تھے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ انھیں میری طرح اس بات پر یقین ہی نہ آتا تھا کہ لوئی بروٹن واقعی سینٹ لوئی جا رہی ہے۔ الہٰ رجیب میں یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہوا ہے، مڑا تو میں نے دیکھا کہ لوئی کے جوش و خروش کے باوجود اس کا کالر اس کے گلے پر بہتے ہوئے خون کے سرخ دھارے میں ایک کانپتی ہوئی مرجھائی ہوئی، پیلی، زرد پتی کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اور یہ کہ میرے چچا کے موٹے کپڑے کے کوٹ کا ایک حصہ کچھ ابھرا ہوا تھا جس سے مجھے ڈر لگ رہا تھا کیونکہ وہاں پستول تھا۔ ان کی گہری کالی آنکھوں میں غصے اور تشدد کی خوفناک چنگاریاں چمک رہی تھیں، جیسے الاؤ سے کالا دھواں بل کھاتا ہوا

اٹھ رہا ہو۔ ان کی آنکھیں گلی پہ جمی تھیں۔ میں نے گلی کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔ دراز قد براکس چیمبرلین ایک نیا براؤن سوٹ پہنے ایکس چینج ہاؤس سے نکل رہا تھا۔ وہ پتھر کی اوپر والی سیڑھیوں پر ایک لمحے کے لیے ٹھہر گیا۔ میکسیکو کا ایک شخص دستی بیگ لیے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ پھر وہ دونوں آباد کاروں کے سفید خیموں کے ڈھیر میں چھپ گئے۔

دوسرا حصّہ

خاوند

۶ ـــــ کچھ ایسی تصویریں بھی ہیں جو اب میرے حافظے سے بالکل اتر چکی ہیں۔ حالانکہ ان کے متعلق میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں اُن کو فراموش کر دوں گا۔ شام کی نیم تاریکی میں بھوری بھوری ریت کا پیلا مرغولہ، جون کی گرم لو میں گھاس، تپتی ہوئی شوریلی زمین پر بے موسمی صحرائی برف کی چمک، یہ سب مناظر اب بھولی بسری یادیں بن چکے ہیں۔ لیکن پچاس برس پہلے کا وہ منظر جو نیلی پہاڑیوں کے سائے میں سالٹ فورک اسٹیشن پر چھایا ہوا تھا، اب تک اسی طرح نظروں کے سامنے ہے، اور اس کی ایک ایک تصویر میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی ہے۔ میں چاہوں بھی تو اس منظر کو دماغ سے نہیں نکال سکتا۔

میں اب بھی چھوٹے سے سرخ ڈپو اور ریل کی پٹڑی کے پاس بنے ہوئے گول تالاب کو دیکھ سکتا ہوں جس کے چاروں طرف پرانے رستوں کا ایک حلقہ تھا۔ میں اب بھی ڈیپاٹ کے گراؤنڈ کے ساتھ ساتھ بچھی ہوئی پٹڑی پر مشرق کی طرف جانے والی اس ریل کی آواز سن سکتا ہوں جو لوٹی برو ٹن کو ہمیشہ کے لئے ہم سے چھیننے والی تھی۔ لوٹی کے کانوں میں بھیڑوں کی آوازیں رہ جائیں گی۔ جمی اور براک اور سارہ کی چیخیں جو پچاس میل دور مویشی خانہ میں اپنی ماں کے لئے رو رہی تھیں، اس کے کانوں میں گونجتی رہ جائیں گی۔ میں اب بھی اپنے چچا کے دیز سے

کچلے ہوئے مگر اس دن تیزی سے ابھرے ہوئے شدید جذبے کو محسوس کرسکتا ہوں
بچا بہ ظاہر بڑے اطمینان سے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے موٹے کپڑے کے
لمبے کوٹ کے نیچے سے پستول کی پیٹی سب کو نظر آ رہی تھی۔ اور وہ شخص جس کے
ساتھ لوٹی جا رہی تھی۔ مگر جس کا نام تہانے سے اس نے صاف انکار کردیا تھا اگرچہ
اس کا نام ہم سب جانتے تھے آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ ہم سے
صرف چند سو گز کے فاصلے پر آبادکاروں کے سفید خیموں میں سے گزر رہا تھا۔

چند آدمی کھالوں اور اون کے گودام کی چھت پر کھڑے ہوئے تھے۔
گاڑی بان اپنی گاڑی سے آٹے کی ساری بوریاں اتار چکا تھا۔ اور اب گاڑی
کے آگے کھڑا تھا۔ کنگ مین مرکنٹائل کمپنی کے گرد بنے ہوئے بنگلے پر کمپنی
کے کلرکوں کے سروں کی قطار نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ
نوجوان وکیل آرکی میڈ اپنے پریشان و مغموم ساتھی ہنری میکرٹن کو اکیلا چھوڑ
گیا ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ اپنے اس آنے والے دوست وکیل کا حشر
دیکھنے کی تاب نہ رکھتا تھا۔

ریل کی سیٹی کی آواز اب چھوٹے مویشی خانہ کے پاس سے آ رہی تھی۔ اور
آخر کار وہ قریب کے کپاس کے کھیت تک آگئی۔ جہاں بچے گرمیوں میں کھیلا
کرتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ خاموش تماشائیوں میں سے کچھ لوگ چوک کی طرف
نہ دیکھنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ اس کے باوجود یہ بات بالکل واضح تھی کہ
ہر شخص کھڑا اس بات کا انتظار کر رہا تھا کہ برالکس چیمبرلین مغربی طرز کی خاکی ٹوپی اور
مشرقی وضع کا بھورا سوٹ پہنے آبادکاروں کے خیموں سے نکل کر چوک میں کب

نمودار ہوگا۔

صرف ایک لوئی بروٹن کسی طرح خاموش نہ ہوتی تھی اور جہاں آفروز مگر مضطر اور بشاش اپنے ہر دوست کو الوداع کہہ رہی تھی۔ کبھی ایک سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھی، کبھی دوسرے سے باتیں کر کر کے ہنستی تھی۔ کبھی مائر اینڈر رووڈ سے بغل گیر ہونے لگتی۔ کبھی کورا ہولڈر نیس کے رخساروں کے جلدی جلدی بوسے لیتی۔ ہر لمحہ اس کے ہاتھ ڈوری میں بندھے ہوئے سفید بازوؤں کی طرح ہل رہے تھے۔

اور جب لوئی بروٹن مجھے الوداع کہنے کے لئے میری طرف مڑی تو کئی عورتیں اب بھی اس سے باتیں کر رہی تھیں۔ لیکن میں دل میں اپنے احساسات کو چھپانے کی خاطر بالکل پتھر بنا ہوا تھا۔

"ٹرنک لانے کا بہت بہت شکریہ"۔ اس نے خوش ہو کر کہا لیکن جب اس نے میرا بوسہ لیا تو میرے ارد گرد خوشبوئیں پھیل گئیں۔ اس نے میرے کان میں آہستہ سے کہا۔

"ہاں! جب تک میں بچوں کو بلاؤں ان کا خیال رکھنا اور ان سے میرے متعلق کوئی بُری بات نہ کہنا"۔

اور اب ریل اپنے انجن سے کالا دھواں اٹھاتی اسٹیشن میں داخل ہو چکی تھی۔ لیکن ہرائس چیمبرلین کے نمودار ہونے کے کوئی آثار نہ تھے۔ ٹرین میں بیٹھی ہوئی مسافر عورتیں پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی پریشان لوئی بروٹن کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ چچا نے اس کا سامان اور تھے ڈبے میں خود رکھوایا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ڈبے میں اس کی نشست کے پاس ہی کھڑے ہوئے ہیں۔ اور وہ کھڑکی سے

اپنا سر باہر نکالے ہنس ہنس کر اپنے اُن دوستوں سے باتیں کر رہی ہے جو تختوں والے پلیٹ فارم پر کھڑے رہ گئے تھے۔ اس کی آوازیں وہی زندگی تھی۔ وہی اونچے سُر تھے، وہی بشاشت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے اور نہ کچھ ہو ہی سکتا تھا۔ وہ صرف دو تین بڑے شہروں کا تفریحی سفر کر کے واپس آجائے گی۔

حتیٰ کہ جب کنڈکٹر نے جواب تک میرے چچا کے احترام میں ان کے اترنے کا انتظار کرتا رہا۔ گاڑی چلانے کی جھنڈی ہلائی۔ اور جب خود لوٹی بروٹن کو اور ہم میں سے ہر شخص کو یہ علم تھا کہ وہ شخص جسے کولوریڈو کے مقام پر ڈسٹرکٹ اٹارنی بننا تھا۔ آبادکاروں کے سفید خیموں سے نکل کر اس کے پاس نہیں آیا ہے۔ لوٹی تن تنہا بیٹھی ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش اور بے نیاز تھی۔ اور کھڑکی سے جھک کر ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں الوداع کہہ رہی تھی اور ہونٹوں سے نازک انگلیاں چھو کر بوسوں کی بارش برسا رہی تھی۔

"الوداع، الوداع!" ایک لمحے کے لئے ہوا پرشوق آوازوں سے بھر گئی۔

پھر وہ چلی گئی۔ پلیٹ فارم دفعتہً خاموش اور خالی ہو گیا۔ اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ کھڑا ہوا۔ اپنی نظروں سے ٹرین کا تعاقب کر رہا تھا۔ جو اب دُور جا چکی تھی اور جس کا اب صرف پچھلا حصہ چند کھڑکیاں اور اوپر سے گزرتا ہوا بل کھاتا ہوا دھواں دکھائی دے رہا تھا۔

صرف چچا ہی ایک ایسے تھے جنھوں نے ٹرین کی طرف نہیں دیکھا۔ ان کے اوپر اٹھے ہوئے چہرے اور کالی گہری آنکھوں سے ہر ایک کو ڈر لگ رہا تھا ایک

تنہا، طاقتور شخص ہوٹل کی طرف جا رہا تھا اور اس وقت کسی کو بھی اس سے گفتگو کرنے کی جرأت نہ ہو رہی تھی۔

۵ ـــــ چچا کے جاتے ہی لوگ ان چھوٹے چھوٹے کتوں کی طرح جو کسی بڑے کتے کے سامنے خوف زدہ ہو گئے ہوں۔ اپنی جگہ سے ہلے اور ادھر ادھر جانے لگے چند لوگ کھسک کر میرے چچا کے وکیل کے پاس آ گئے۔

اُن میں سے ایک نے پوچھا "میکرٹن صاحب سنا ہے برائنس چیمبرلین اس وقت اپنے دفتر میں ہیں اور آرکی میڈ بھی ان کے پاس ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے چیمبرلین اب کیا کریں گے؟ کیا وہ کل صبح کی گاڑی سے جائیں گے؟

ہنری میکرٹن کی آنکھیں اس کے بھاری رخساروں میں پتھر کے چھوٹے چھوٹے گڑھے سے معلوم ہوتی تھیں۔

"برائنس چیمبرلین جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ ہمیں کبھی نہیں بتائیں گے۔" اس نے لوگوں سے کہا اور جلدی سے چوک کی طرف چلا گیا۔

میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ مجھے بھی ہنری میکرٹن سے زیادہ علم نہیں تھا۔ ہم سارا دن توقع کے خلاف قصبے ہی میں رہے۔ چچا نے جان کنگ بین سے ایک ہزار ڈالر نکلوائے۔ وہ اپنی دکان میں بینک کا بھی کاروبار کرتا تھا جب اگلے روز مشرق کی طرف جانے والی ٹرین کا وقت قریب آیا تو چچا تختوں والے پلیٹ

فارم پر پہنچ چکے تھے۔ ڈپو کے ارد گرد دو سو گز زمین پر انسانوں کا ہجوم تھا۔ وہ سب اس بات کے منتظر تھے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا تھا۔ ہر شخص اپنی بے چینی کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ لوگ گاڑیوں کے ارد گرد بھیڑ لگائے تھے اور کچھ گھوڑوں پہ بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ قریب ہی بھیڑوں کا ایک باڑا تھا جس کے چاروں طرف تختے لگے تھے۔ اس باڑے سے تمباکو اور کرم کش دوا کی بو اٹھ رہی تھی جس سے بھیڑیں نہلائی جاتی ہیں۔ چچا اپنے پرانے دوستوں اور دشمنوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پلیٹ فارم پر بڑے متکبرانہ انداز میں ٹہل رہے تھے۔ ان کے کوٹ کے نیچے سے اب بھی پستول نظر آ رہا تھا۔ ان کا سر بڑی توپ کی طرح اوپر اٹھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی ان کی گہری کالی آنکھوں سے نڈر نگاہیں نکل کر چوک کی طرف جاتی تھیں۔

بعد میں ہنری سیکرٹن نے مجھے بتایا کہ چچا کا خیال محض یہ تھا کہ وہ برائس چیمبرلین کے ہمراہ ٹرین میں بیٹھ کر جائیں گے۔ اور جہاں وہ جائے گا۔ اس کے پیچھے جائیں گے۔ اور جب انہیں یقین ہو جائے گا کہ اسی شخص نے ان کی بیوی کو ورغلایا تھا تو وہ واپس آ جائیں گے۔ لیکن چیمبرلین اس روز بھی نہ آیا اور اس سے اگلے روز بھی نہ آیا۔ کسی شخص نے بھی اسے یا اس کے سامان کو چوک میں سے گزرتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ لیکن عام طور پر لوگوں کا خیال یہ تھا کہ وہ اپنے رشتہ دار جان ہولڈرنیس کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے جس کے مکان سے یکے بعد دیگرے بے شمار تار بھیجے جا رہے تھے۔ اور ہر بار واشنگٹن جا رہا تھا۔

لوٹی بریڈٹن کی طرفداری میں اس شخص کو بڑا بے شرم سمجھ رہا تھا جس نے

بزدلی دکھا کر اُسے تو روانہ کر دیا اور خود بدستور سالٹ فورک میں مقیم رہا۔ حالانکہ سالٹ فورٹ کا ہر شخص اُن کے تعلقات سے بخوبی واقف تھا۔ حتیٰ کہ اس کا دوست آرکی بیڈ بھی کچھ شرمندہ سا تھا اور چوک سے جلدی جلدی گزر کر برائس چیمبرلین کے دفتر میں گھس جاتا تھا۔ تاکہ لوگ اس پر سوالوں کی بوچھاڑ نہ کر دیں۔ میرے چچا کے سخت چہرے پر نفرت جم کر رہ گئی تھی۔

چوتھے دن یہ حالت تھی کہ وہ ڈپو نہیں جانا چاہتے تھے۔ کئی روز بعد کا ذکر ہے کہ ہم شام کو ہوٹل کے کھانے کے کمرہ میں کھانا کھا رہے تھے۔ ہمارے سروں کے اوپر ہرنوں کے مصنوعی سر اور بچھڑوں کے لمبے لمبے، مڑے ہوئے سینگ لگے تھے، جن میں اس ہوٹل میں ٹھہرنے والے مسافروں کے پستول لٹکے ہوئے تھے۔

چچا نے کسی قدر بیزاری کے ساتھ مجھ سے کہا: "ہاں! تم چاہو تو کل صبح مویشی خانے جا سکتے ہو۔ اور اپنی گاڑی بھی لے جا سکتے ہو۔"

میں دوسری صبح مویشی خانے چلا آیا اور پورے ہفتے سونے کے بڑے تاریک کمرے میں سرخ صوفے ہی پر سوتا رہا۔ چچا جب مویشی خانے آیا کرتے تھے تو اسی کمرے میں سویا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب اس رات میں سونے کے لئے لیٹا تو ابھی شام کا جھٹپٹا تھا۔ اس رات اتنی گرمی تھی کہ میں نے اپنی چادر صوفے پر اپنے پیروں کے قریب رکھی اور جب اتفاقاً میری آنکھ کھلی، تو میں یہ سمجھا کہ رقص گاہوں میں یہ شور اُن گوالوں نے مچا رکھا ہے جو کسی دور دراز مویشی خانے سے یہاں شور مچانے اور لطف پیدا کرنے کے لئے آئے ہوں گے۔

پھر میں نے دیکھا کہ تاریک کمرے میں باہر سے روشنی چھن چھن کر آ رہی ہے۔ میں جلدی سے اٹھا اور کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آباد کاروں کا ایک لمبا جلوس خیموں سے شروع ہو کر پلازا کے گرد جمع ہو رہا تھا۔ سبھی مرد تھے۔ ان میں سے کچھ گھوڑوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ کچھ پیدل تھے۔ ریشمین رنگین قمیصیں، سادہ قمیصیں، ہلکے نیلے رنگ کی دھاری دار قمیصیں اور موٹے کپڑے کی کھوری کھوری صدریاں سب نے حسب توفیق پہن رکھی تھیں۔

کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں لمبی نال والی چھوٹی گولیوں کی رائفلیں بھی تھیں لیکن بیشتر لوگوں کے پاس بیلچے اور بیلیاں تھیں۔ کچھ کے ہاتھوں میں امریکی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ دو تین شمعیں بھی تھیں جن کی روشنی میں ان کے داڑھی والے چہرے نظر آ رہے تھے۔ ٹینیسی سے آنے والے کاشت کاروں کے چہرے، ارکنساس کے شکاریوں کے چہرے، مزدوری کے لکڑہارے، لوئزیانا کے ملّاح اور مشرقی ٹیکساس کے جولاہے اور دست کار، مزارعے، کاروباری لوگ سبھی یہاں آئے ہوئے تھے، جن کی زندگی مسسپی اور الاباما کی نصف درجن ریاستوں میں بڑی مشکل سے بسر ہوتی تھی۔

جلوس برابر بڑھ رہا تھا۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے اور جوتے پہنے اور ہوٹل کی سیڑھیوں پر، چھت میں لٹکی ہوئی جھولتی ہوئی لالٹین کے نیچے سے دوڑتا ہوا گلی میں آ گیا۔ گلی خالی پڑی تھی۔ پورا جلوس ہولڈنبیں کے مکان کے سامنے جمع ہو گیا تھا جو سالٹ فورک کی عمارتوں میں سب سے اونچا اور شاندار تھا۔ شمعوں کی روشنی میں پلستر کی ہوئی اینٹیں، پیلی لکڑی کا کام اور چھت پر لگی ہوئی گول آنکھوں والی برجی اور بھی خوبصورت لگ رہی تھی۔

میں اصطبل کی دیوار سے لگا کھڑا تھا، اچانک آبا دکاروں کے جلوس سے ایک زبردست شور بلند ہوا۔ نعرے لگنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ دراز قد برائس چیمبرلین ہولڈ زیس کی سامنے والی گیلری میں آگیا تھا۔ شمعوں کی روشنی وہ اتنی دور سے بھی کچھ پیلا پیلا سا نظر آرہا تھا۔ لیکن اپنے لمبے کوٹ میں وہ پہلے کی طرح مستقل مزاج اور چاق و چوبند معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے سنہری بال بڑی خوش سلیقگی سے پیشانی سے پیچھے کو پڑے ہوئے تھے، جیسے ابھی ابھی کنگھی کی گئی ہو، پھر وہ گویا تقریر کرنے کے لئے پیشہ ور خطیبوں کے انداز میں کٹہرے کی طرف اندر اور آگے آیا۔

اس نے شروع میں جو باتیں کیں وہ مجھے سنائی نہ دیں۔ کیونکہ اس نے بہت دھیمی آواز میں تقریر شروع کی تھی۔ پھر تو اس کی آواز پوری گلی میں گونجنے لگی۔ اور میرا خیال ہے اس کی آواز چوک تک جا رہی ہوگی۔

اس نے لوگوں کو للکارتے ہوئے کہا (اس وقت اس کی آنکھوں میں نیلی نیلی آگ چمک رہی تھی) میں آپ کو یہ صاف صاف بتائے دیتا ہوں کہ صدر مملکت میرے ذاتی دوست ہیں۔ اور جب تک اس پسماندہ علاقہ میں جبر و تشدد کی طاقتیں تمہیں کچلیں گی، تمہیں برباد کریں گی تو میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ واشنگٹن میں چین سے نہ بیٹھے رہیں گے۔ صدر ریاست نے مجھے آج سے آپ کی ڈسٹرکٹ کورٹ کا جج مقرر کر دیا ہے۔ مجھے اب اس کے سوا کوئی اور تشویش نہیں کہ سینٹ میرے تقرر کی توثیق کرتی ہے یا نہیں۔

"جج چیمبرلین زندہ باد" کے نعرے پوری گلی میں گونج رہے تھے اور اس کے تقرر کی توثیق کر رہے تھے۔ لیکن میں ان نعروں کو نہیں سن رہا تھا کیونکہ میں

اصطبل کی ادوٹ میں کھڑا ہوا یہ محسوس کر رہا تھا کہ کوئی بہت ہی المناک بات غیر متوقع طور پر ظہور میں آگئی ہے۔ کوئی ایسی بات جسے لوٹی بروٹن کا تیز دماغ بھی، جو ہر چیز کی تہہ میں تلوار کی نوک کی طرح اتر جاتا تھا، پہلے سے نہ سمجھ سکا تھا۔

اور میں تو اب تک وہ بات نہیں سمجھ سکا۔ حالانکہ اب ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر اس طرح بیٹھ گئی ہے جس طرح گھوڑے اصطبل میں داخل ہو کر اپنے اپنے تھان پر پہنچ جاتے ہیں۔ ہاں اس وقت یہ بات البتہ میری سمجھ میں آگئی تھی کہ برائس چیمبرلین نے ایک وکیل کی حیثیت سے میرے چچا کی اس خاموش دھمکی کا جواب دینا شروع کر دیا ہے جو انھوں نے اس گمنام شخص کو دی تھی جسے لوٹی بروٹن کے ساتھ جانا تھا، اور اس نے پہلا قدم یہ اٹھایا تھا کہ سالٹ فورک کے چند لوگوں کی نظروں میں وہ اپنے آپ کو نیک ثابت کر دے تاکہ وہ یہ کہہ سکیں کہ ہمارا نیا جج تو اتنا شریف اور نیک ہے کہ وہ کسی اور کی بیوی کے ساتھ ٹرین میں بیٹھ کر ڈن تدرجانے کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتا۔

ہوٹل واپس آتے ہوئے میں اس غصے کی شدت کو محسوس کر رہا تھا جو میرے دل میں چیمبرلین کے خلاف پیدا ہو رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اب لوٹی بروٹن کیا کرے گی، کہاں جائے گی؟ اور جب میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ چچا وہاں پہلے سے موجود تھے۔ انھوں نے قمیص اتاری ہوئی تھی، ان کے سینے پر کالے بالوں کے چھتے نکھی کی گدی کے بالوں کی طرح اگ آئے تھے انھوں نے اپنے جوتے اتارتے اور سونے کے کپڑے پہنتے وقت میری طرف کوئی توجہ نہ دی۔ پھر جب وہ سونے کے لئے بالکل تیار ہو گئے تو انھوں نے مجھے کچھ ایسی نظروں

سے دیکھا کہ میں وہیں کا وہیں جم کر رہ گیا۔ اور میری نظریں جھک کر اس فرش پر گڑ گئیں۔ جس پر ابھی تک آبادکاروں کی شمعوں کی روشنی کا عکس پڑ رہا تھا۔ پھر انھوں نے اپنے اتارتے ہوئے اور ایک طرف پھینکے ہوئے کوٹ کی اندر والی جیب سے ایک چمڑے کا بٹوہ نکالا۔ اور مجھ سے کہا: "اسے تکیہ کے نیچے رکھ دو۔ کل صبح تمہیں ٹاؤن ورجانا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں تم وہاں لوٹی کو ڈھونڈھ کر یہ رقم دے دو۔ انھیں پیسے کی ضرورت ہوگی۔"

"بہت اچھا!" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ اب تک میں یہ جان چکا تھا کہ چچا کو چیمبرلین کے تقرر کا علم ہو چکا ہے۔ مگر میں سوچ یہ رہا تھا کہ میں لوٹی برونٹن کو ڈھونڈھ تو لوں گا لیکن میں اسے کسی ذلت کی حالت میں نہ دیکھ سکوں گا۔ پھر بھی میں اپنے خون میں چھپے ہوئے اس ناقابلِ بیان اشتیاق کو محسوس کر رہا تھا کہ مجھے اسے دوبارہ ضرور دیکھنا چاہیئے۔

میں چچا کو بتانا چاہتا تھا کہ براٹس چیمبرلین نے آج آبادکاروں کے سامنے کیا تقریر کی ہے اور ان سے کیا وعدے کئے ہیں۔ لیکن مجھ میں اتنی جرأت نہ ہوئی۔ وہ اپنی لمبی سفید سوتی قمیص، کالی گہری آنکھوں، لمبے لمبے سیاہ بالوں اور مونچھوں کی وجہ سے مجھے اس مطلق العنان اور جابر سردار کی یاد دلا رہے تھے۔ جس کا ذکر میں نے اسکول میں پڑھا تھا۔ پھر وہ اپنے بڑے پلنگ پر لیٹ گئے۔ میں کپڑے بدل کر اور بتی بجھا کر اپنے کمرے میں آگیا۔ مجھے تاریکی میں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ابھی تک بڑی شان سے بے حس و حرکت چت لیٹے ہوئے ہیں۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور وہ چھت کی طرف تک رہے ہیں۔

لیکن رات کو ایک دفعہ میری آنکھ کھلی تو میں نے سنا کہ وہ ٹہل رہے ہیں اور بڑبڑا رہے ہیں۔ اور ایک دفعہ تو ان کی آواز بہت بھاری اور بلند تھی بالکل ویسی ہی آواز جو وہ مویشیوں کو ہانکتے وقت اور کارندوں کو حکم دیتے وقت نکالا کرتے تھے لیکن آج رات ان کی آواز کسی غلط ارادے کی غماز تھی۔ اور اس کا کوئی مفہوم نہ تھا۔

۸۔ جب میں ٹرین سے اتر کر زندگی میں پہلی مرتبہ ڈن ور کے نئے شہر میں داخل ہوا تو اس صبح اس مالدار پہاڑی شہر کے اوپر چمکتی ہوئی شاندار دھوپ سنہری شال کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ عجیب و غریب اشاروں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا انجنوں سے بچتا بچاتا میں ڈپو پر پہنچ گیا۔ جونہی میں گلی کے کو عبور کرنے لگا۔ کپڑے کی دکانوں۔ نیلام گھروں اور کمیشن ایجنٹ کی دکانوں سے آنے والی آوازیں بڑے خوشامدانہ انداز میں مجھے اپنی طرف بلانے لگیں "جناب عالی! ادھر آیئے حضور تشریف لایئے، بابو صاحب ادھر آیئے" ان گلیوں میں جنھیں میں عبور کر رہا تھا۔ پاس سے گزرتی ہوئی گاڑیوں میں بیٹھی ہوئی عورتوں کے بیش قیمت لباس میں حتیٰ کہ اس ہوا میں بھی جو پہاڑیوں سے آ رہی تھی کوئی ایسی خاص بات تھی جو لوٹی پروٹن کی طرح شاندار، چمک دار اور ہشاش بشاش تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں یہاں آتے ہی لوٹی کے اس شہر میں جو دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہے آنے کے اشتیاق کو کچھ کچھ سمجھ گیا ہوں۔

روپے کی افراط اور شاندار زندگی کے آثار تو میرے چچا کے دوست جارج ٹویچل کی دکان میں بھی موجود تھے۔ میں اس دوکان کے فرش پر چلتے ہوئے یوں محسوس کر رہا تھا کہ میں چاندی کے فرش پر چل رہا ہوں، حالانکہ جارج کی دکان محض لوہے کے آلات اور برتنوں کی دکان تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ سینٹ لوئی کے مغربی حصے میں سب سے بڑی دکان وہی تھی۔ درجنوں ریاستوں اور ضلعوں سے آتے ہوئے لوگ بندوقوں سے لے کر کان کنی کی مشینیں تک خریدر ہے تھے۔ اور ساتھ ساتھ مذاق بھی کرتے جاتے تھے، دوسروں کو ہنساتے تھے۔ اور جب جارج ٹویچل دوپہر کا کھانا کھلانے کے لئے مجھے اپنی شاندار حویلی میں لے گیا جس کے آگے ایک بڑا آرائشی جنگلا لگا ہوا تھا۔ اور ایک کینیڈا کی بطخ فوارہ کے چاروں طرف تیر رہی تھی۔ تو میں فوراً سمجھ گیا کہ میرے چچا نے لوئی برروٹن کی واپسی کے متعلق کوئی بات کیوں نہیں کہی تھی۔ اس لئے کہ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ وہ ٹاؤن در ہیں صرف ایک ہزار ڈالر کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہ سکتی۔

میں اسی شام گردن اکڑائے نئے نئے بنے ہوئے براؤن پیلیس ہوٹل کی طرف جا رہا تھا۔ میری جیب میں چچا کا دیا ہوا بٹوہ تھا۔ ڈاؤن ٹاؤن کے ایک حجام سے بال تازہ تازہ بنوائے تھے۔ جوتوں کی پالش خوب چمک رہی تھی۔ اور میرے پاس ایک خوبصورت تعارفی کارڈ بھی تھا جس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے "ہیری برروٹن" جارج ٹویچل نے یہ الفاظ خود اپنے ہاتھ سے خوب بنا بنا کر لکھے تھے۔ اس نے الفاظ کے چاروں طرف ایک خوبصورت حاشیہ بھی بنا دیا تھا۔ ۹۸۲۸۴

جب میں ہوٹل میں داخل ہوا تو پھر زندہ دل عورتیں اپنے سامنے سرسراتی ہوئی

میرے پاس سے گزریں۔ انھوں نے ہیٹ اور دستانے پہنے ہوئے تھے۔ ریشم اور ساٹن کے لباس، بالوں میں لگے ہوئے ربن، جھالریں، سنجاف، فیتے، رومالوں میں چنٹیں پڑی ہوئیں وہ ایک دوسری سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہوئی چلی گئیں۔ اور میں اپنے چچا کے حوض میں تیرتی ہوئی بطخوں کو یاد کرتا رہ گیا۔ تاہم ان کے بالوں میں لگے ہوئے پھولوں اور عطروں کی خوشبوئیں دیر تک میرے پاس رہیں۔ پہلے تو مجھے شبہ تھا، لیکن اب پکا یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو لوٹی بروٹن مجھے ابھی اور یہیں ملے گی۔

ایک خوش مزاج کلرک نے جس کی داڑھی بہت مختصر اور کترنی ہوئی تھی اور جس نے لمبا کوٹ پہن رکھا تھا، میرا کارڈ اپنی انگلیوں میں پکڑ لیا۔

"مسز کرنل بروٹن کون ہیں؟" اس نے رک کر دوبارہ کہا "ہاں ہاں یاد آیا! مسز لوٹی کیمرن بروٹن۔ اس کا چہرہ ایک دم پھول کی طرح کھل اٹھا اور اس نے فوراً ہی میرا احترام کرنا شروع کر دیا۔ مجھے بھی فوراً یہ معلوم ہو گیا کہ یہ شخص لوٹی سے ضرور ملا ہے اور اس سے باتیں بھی ضرور کی ہیں۔ اور ایک لمحے کے لئے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سُرخ قالین والی سیڑھیوں پر وہ آہستہ آہستہ قدم جماتے ہوئے میرے پاس آگئی ہے اور اس نے اپنی تیز نوکیلی اور واضح آواز میں مجھے پکارا ہے "ہاں!" اور اس نے اپنے حساس بازو میری گردن میں حمائل کر دئے ہیں۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ کلرک کے چہرے پر مایوسی کے بادل چھا گئے ہیں۔ اور وہ بڑے سچے پچھتاوے کے ساتھ مجھ سے کہہ رہا ہے "ہماری سب کی یہ خواہش تھی کہ مسز بروٹن کچھ عرصہ اور رہتیں"

ایک دم مجھے یوں لگا جیسے کوئی بہت ہی خوبصورت چیز میرے ہاتھوں سے

نکل گئی ہے۔ کلرک ایک چمڑے کی جلد کے کھاتہ کے اوراق الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مسز براؤن یہاں پرسوں تک تو موجود تھیں۔ میرا خیال ہے ان کا کوئی خط آیا تھا یا شاید تار۔ مجھے یاد ہے وہ بہت خوش تھیں۔ لیکن میں اپنا یہ تاثر نہیں بھول سکتا کہ وہ پریشان بھی ضرور تھیں۔ انھوں نے ہمارا بل ادا کیا اور ہوٹل سے چلی گئیں۔ انھوں نے ہمیں اپنا کوئی پتا بھی نہیں دیا۔ ہمیں بڑا افسوس ہے کہ ہم آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکے۔"

جب میں ہوٹل سے نکل کر گلی میں آیا تو سورج ایک بادل کے پیچھے روپوش ہو گیا تھا۔ اور شہر کی خوشبو دار ہوا جانے کہاں بھاگ گئی تھی۔ اور آئندہ پورے ہفتے جب تک میں دوسرے ہوٹلوں اور رہائش خانوں میں اسے ڈھونڈتا رہا۔ اور گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر اس خوبصورت چہرے اور نازک لچک دار جسم کو شہر کے ایک ایک کونے میں تلاش کرتا رہا۔ اور کسی دیوار کے ساتھ لگ کر ساری سہ پہر آنے جانے والی گاڑیوں اور کاروں میں عورتوں کے چہرے پڑھتا رہا۔ میں نے سورج کی شکل دوبارہ نہیں دیکھی۔ جارج ٹڈیکل میری سیر و تفریح کا خاص خیال رکھتے تھے وہ ہر رات مجھے کسی نئے اور بہتر ریستوران میں لے جاتے، ٹیمپر گراؤنڈ فلور لے جاتے اس کچی اینٹ کے خاموش اور سنسان مکان میں بھی لے جاتے جو اوپر جا کر محض ایک بڑا سا کمرہ بن جاتا تھا، جہاں بیسیوں میزوں پہ مرد اور عورتیں جوا کھیلتی تھیں جو دیوار پہ لٹکی ہوئی بڑی بڑی عریاں تصویروں کا خیال تک نہ کرتی تھیں حالانکہ انھیں دیکھ کر شرم کے مارے میرے کان تک سرخ ہو جاتے تھے۔

اور جب پورا ایک ہفتہ ختم ہو چکا تو میرے پاس بے شمار چہروں کی تصویروں کے سوا اور کچھ نہ تھا جو سوتے میں میری آنکھوں کے سامنے سے گزرتی تھیں میری طرف دیکھتی ہوئی، گھورتی ہوئی عورتوں کے چہرے، گھریلو اور خوبصورت چہرے، نرم اور سخت چہرے مغموم اور مسرور چہرے، مگر کسی ایک چہرے میں بھی وہ نایاب چیز نہیں تھی جسے دیکھ کر میں پکار اٹھتا " لوئی بروٹن "!

پیر کی صبح کو میں نے لوہے کی اس دکان کی آہنی تجوری میں سے چچا کا بٹوہ نکالا تو جارج ٹو ہچل نے مجھے خوش کرنے کے لئے کہا " وہ غالباً گھر چلی گئی ہوں گی۔ بھلا اور کہاں جا سکتی ہیں۔ جب تم مویشی خانے پہنچو گے تو وہ تمہیں برآمدے میں بیٹھی ہوئی ملیں گی "

وہ اچھا دراز قد مگر دبلا پتلا اور حوصلہ مند آدمی تھا، اور اس کی ایک ایک بات سے خود اعتمادی ٹپکتی تھی۔ لیکن جب میں سالٹ فورک پہنچا۔ اور میں نے قصبے کی گرد آلود گلیوں اور پیدل چلنے کی پٹڑیوں کو پیلی پیلی دھوپ میں سویا ہوا دیکھا تو مجھے معاً احساس ہوا کہ گزشتہ کئی دنوں سے ان گلیوں اور پٹڑیوں نے لوئی بروٹن کے نازک اور زنانہ پیروں سے آہستہ آہستہ کچلے جانے کی لذت محسوس نہیں کی ہے۔

جان کنگ مین اپنی مرکنٹائل کمپنی کے کاؤنٹر پر کھڑا ہوا رقم گن رہا تھا، انگلیوں کے ساتھ ساتھ اس کی بڑی ڈاڑھی میں چھپے ہوئے ہونٹ بھی آہستہ آہستہ ہل رہے تھے جب میں اسٹور میں داخل ہوا تو ایک دفعہ اس کی گہری نظروں نے میرا تعاقب کیا۔ اور جب میں ڈیگیٹ کے اصطبل کے سامنے والے کھلے دروازوں سے باہر نکلا تو فرینک ڈیگیٹ کی نظروں نے بھی میرا تعاقب کیا۔ پھر میں سب کچھ سمجھ گیا۔

اس نے میرا استقبال کرتے ہوئے کہا ہیلو ہل! کیا حال ہے؟ ڈن ورد میں ہاتھی دیکھے، آلو دیکھے؟ اور جب میں نے سر ہلا کر ہاں کہا تو اس نے کہا "تمہاری گاڑی شارٹی لوون لے گیا تھا۔ کہتا تھا تمہیں ضرورت پڑے تو بگھی کرایہ پر لے لینا۔"

"مجھے ضرورت نہیں ہے" میں نے اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے قدرے رکھائی سے کہا۔

وہ قابلِ بیان حد تک مغموم ہو گیا۔ کہنے لگا "بات یہ ہے کہ اُسے مویشی خانے کا رتوسوں کے ڈبے لے جانے تھے۔"

اس کی یہ بات سن کر میرے کان جلنے لگے لیکن اس کے چہرے پر کسی جذبے کا کوئی اظہار نہ تھا۔ اور جب اس نے میرے لئے ایک گھوڑا اصطبل سے نکلوایا اس وقت بھی اس نے کسی جذبے کا اظہار نہ کیا۔ میں نے خود گھوڑے کا منہ بڑی مشکل سے کھول کر لگام ڈالی حالانکہ اس کے منہ سے جوار کی ہری ہری رال بہہ رہی تھی۔

جب میں گھوڑے پر بیٹھا ہوا اس پتھریلی گلی میں سے گزر رہا تھا جس میں میں اور لوٹی بروٹن کافی عرصہ پہلے پیدل چلے تھے تو میں نے دیکھا کہ برالسن جیمیرلین بھی ایک کرایہ کی بگھی میں میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے ویسا ہی شاندار کالا کوٹ پہن رکھا تھا جیسا جج دائٹ پہنا کرتا تھا۔ اس نے ہمیشہ ہی مجھے دوست بنانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن آج اس نے میرا استقبال بڑی رکھائی اور محض دکھاوے کی خاطر کیا۔ میں نے بھی جواب میں بڑی رکھائی کا ثبوت دیا۔ اور اپنی تیوری چڑھائے رکھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ شخص اس راستے پر کیوں آیا ہے جو سوائے مویشی خانہ کے کسی اور طرف نہیں جاتا۔

اور جب میرا گھوڑا ریتیلی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر چڑھا تو میں سب کچھ سمجھ گیا۔ آبادکاروں کے خیموں کا سلسلہ اب گھٹاؤں کی طرح دریا کے کنارے تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ یہ سفید خیموں اور گاڑیوں کا متحرک شہر تھا جس کے گھوڑے، خچر، مٹو، بیل اور دودھ دینے والی گائیں میلوں تک پھیلی ہوئی گھاس چر رہی تھیں۔

جوں جوں میں پگڈنڈی پر چلتے چلتے بتدریج قریب ہوتا گیا، میرے کان اس شہر کے ہنگاموں اور آوازوں سے آشنا ہونے لگے۔ گاڑیوں کے پہیوں کے چرچرانے کی آوازیں، اہرن پر پڑتی ہوئی ہتھوڑے کی آوازیں، لوگوں کے ایک دوسرے کو پکارنے کی آوازیں، خیموں کے آس پاس آبادکاروں کا چیونٹیوں کی طرح نقل و حرکت کرنا، ایک خیمے میں داخل ہو رہا ہے۔ دوسرا باہر نکل رہا ہے۔ بے شمار مرد اور عورتیں گاڑیوں سے سامان اتار رہی تھیں۔ ادھر وسیع سبزہ زار میں مرد اور لڑکے گھوڑوں پر چڑھے مویشیوں کو گھیر کر خیموں کی طرف ہانک رہے تھے۔

اب میں یہ بات اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ براٹس چیمبرلین کہاں گیا تھا اور اگر میں اب نہ سمجھتا تو اس وقت تو سمجھ ہی لیتا جب میں نے شام کو مویشی خانے پہنچ کر یہ دیکھا کہ مویشی خانہ تقریباً اسلحہ خانہ بن چکا ہے جس میں چھ فائر کرنے والے پستولوں اور بیک وقت کئی فائر کرنے والی ونچسٹر رائفلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اور باہر سیلان میں لالٹین کے گرد ہمارے کارندے اتنی تعداد میں جمع تھے کہ میں نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ تلی ہوئی مچھلی کے قتلوں اور بسکٹوں کی ٹین کی طشتریاں ان کی گود میں اور کالے قہوے کے ٹین کے پیالے ان کے ہاتھوں میں تھے۔ اور ان کی آنکھوں میں وہی قہر آلود چمک تھی جس کا مفہوم میں اچھی طرح جانتا تھا۔

۹ - میں جنگ کے ان چھائے ہوئے سیاہ بادلوں کو دیکھ کر خوش ہو گیا کیونکہ مجھے لوٹی کے متعلق اپنی روئداد سنانے کو ملتوی کرنے کا ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہو گیا کہ چچا جب نیم تاریک ہال کمرے میں کھرلے آباد کاروں کی سرگرمیوں کے متعلق میری باتیں سنتے رہے تھے اور ان کی تعداد اور ان کے خیموں کے متعلق سوال پہ سوال کرتے رہے تھے، تو سارا وقت ان کے دماغ میں ایک ہی وجود لبسا ہوا تھا۔

آخرکار انھوں نے پوچھ ہی لیا "کیا تمھیں لوٹی نہیں ملیں؟"

میں نے رک رک کر اپنی وہ ساری داستان کہہ سنائی جو مجھے ڈن ونڈر میں پیش آئی تھی۔ انھوں نے اس دوران میں زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔ لیکن جب بلیک ہیٹی بچوں کے کمرے سے نکل کر لیمپ جلانے آئی تو میں نے دیکھا چچا کے چوڑے چہرے پہ غصے کی لکیریں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور ان کی آنکھوں میں لال لال چنگاریاں چمک رہی ہیں۔ اور اب میں جان گیا ہوں کہ یہ اس شخص کے خلاف نفرت کا جذبہ تھا جس نے لوٹی بررٹن کو دھوکا دیا تھا۔ اور اگلے دن جب ہمارے ایک گھڑ سوار نے یہ خبر سنائی کہ آبادکاروں نے دریا کے پاس سے اپنے خیمے اٹھا لئے ہیں اور اب وہ ہمارے زرخیز اور وسیع سبزہ زار کے مشرقی حصے میں جمع ہوئے ہیں اور ان کی گاڑیاں پہلے ہی وہاں پہنچ چکی ہیں۔ تو تشدد ان کے چہرے پر اس زبردست سیلاب کی طرح اکٹھا ہو گیا جو بہے تو ملک کے بڑے سے بڑے بند کو بھی اپنے ساتھ بہا لئے جائے، اور ان کی آنکھوں کے کالے بادلوں سے غصے کی بجلیاں چمک چمک کر نکل رہی تھیں۔

"کیا آج چیمپین آبادکاروں کے ساتھ ہے؟" انھوں نے پوچھا۔
"جی ہاں، میں نے انھیں ایک بگھی میں دیکھا تھا۔" گوالے نے جواب دیا۔
"تو جاؤ اور جوانوں سے کہو گھوڑوں کے ساز کس لیں۔" میرے چچا نے حکم دیا۔

میں اس حکم کا مطلب جانتا تھا۔ اور جب کارندہ چلا گیا، تو مجھے احساس ہوا کہ یہ بات میرے چچا نے میرے چہرے پر پڑھ لی ہے کہ میں ان کے حکم کا مطلب جانتا ہوں، کیونکہ ان کی خائف نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ کہنے لگے "دیکھو لڑکے میری بات گرہ باندھ لو۔ زندگی میں کچھ ایسے سخت مقام بھی آتے ہیں جب تمھیں بھی سخت ہونا پڑتا ہے۔ اگر تم آج کسی شخص سے نرمی کا سلوک کر کے اسے اس بات کی اجازت دیتے ہو کہ کل وہ تمھیں تباہ کر دے۔ تو یہ عزت کی بات نہیں ہے۔ کوئی بھی ایسے شخص کا احترام نہیں کرتا۔ تم کل صبح کا سورج نکلنے سے پہلے ایسی باتیں ہوتے دیکھو گے جو بظاہر اچھی نہیں ہیں۔ اس لئے اگر کالج کی تعلیم نے تمھیں عورت بنا دیا ہے تو بہتر یہی ہے کہ تم گھر پر ہی رہو۔"

"میں کم از کم ایک آبادکار سے تو نمٹ ہی سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔
ان کے انداز کو دیکھ کر میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ آج یہ ضرور حملہ کریں گے۔ گھوڑے کی پیٹھ پر ـــــ وہ اپنے موٹے کپڑے کے کوٹ میں بالکل پتھر کی طرح سختی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کوٹ کندھوں پر پوری طرح کسا ہوا تھا۔ کیونکہ سارے بٹن لگے ہوئے تھے اور کوٹ کے پچھلے دامن گدی پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے بڑے بڑے شکنوں والے جوتے جو دوسرے طرز کے نمائشی جوتوں سے بالکل مختلف اور کہیں

زیادہ مضبوط تھے لیکن ان پر جب سے لوٹی برونٹن گئی تھی، پالش نہ گئی تھی۔ پھر انھوں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اور مویشیوں کے باڑے کی طرف ہو لئے۔

پھر جب ہم بن کھٹی اور پھلواری کی اس ہری ہری دیوار کے پاس سے گزرے جو لوٹی برونٹن نے لگوائی تھی۔ تو میں نے دیکھا کہ باڑے کے باہر کھڑے ہوئے ہمارے کمانڈر تین گھڑسواروں کی طرف گھور رہے تھے جو برابر انہی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دھوپ کی سنہری کرنیں ان کے چہروں اور ان کی گدیوں کو چمکا رہی تھیں۔ اور جب وہ اور قریب آئے تو نظر آیا کہ انھوں نے نیلے کی وردی پہن رکھی ہے تلواروں کے دستوں پر نئی نئی پالش کی ہوئی ہے جھکے ہوئے ہیٹ ہیں جن پر سنہری حاشیہ ہے یہ افسر فورٹ ایونگ سے آرہے تھے۔

میرے چچا نے کسی ایسے منہ زور سرکش گھوڑے کی طرح اپنا منہ اوپر اٹھایا ہوا تھا جو بغاوت پر پوری طرح تلا ہوا ہو۔ وہ بڑی مغرور اور گستاخ عظمت و جلالت کے ساتھ آنے والوں کا انتظار کرنے لگے۔ سفید داغوں کے چہرے والا چتکبرا گھوڑا ذرا آگے بڑھا تو معلوم ہوا کہ اس کا سوار میجر دلہر فورس ہے جس کی بڑی بڑی سرخ مونچھیں ہیں۔ اور اس کی ایک ایک بات میں وقار ہے، خود اعتمادی ہے۔

اس نے موٹے دستانے ہاتھوں سے اتارے، اور مصافحہ کرنے کے لئے گدی پر سے اتر کر ہماری طرف بڑھا۔

اس نے مستقبلیہ انداز میں کہا "کرنل صاحب! ہم موسم بہار تک آپ کے وسیع سبزہ زار میں اپنے خیمے لگا رہے ہیں۔ ہماری کمان میں ہینسٹھ آدمیوں کا دستہ دیا گیا ہے ہیں اور کپتان صاحب آپ کے پاس آئے بغیر نہ رہ سکے۔ ہم نے سوچا

آپ کے ساتھ کھانا ہی کھا آئیں "

اس نے جو کچھ کہا صاف صاف اور دوستانہ انداز میں کہا لیکن ہمارے کارندوں کے چہروں پہ دہشت چھا گئی۔ وہ بڑے غور سے چچا کی طرف دیکھ رہے تھے جو اب اپنی جگہ پہ بڑے وقار سے کھڑے ہوئے تھے۔ اُن کی مونچھیں تنی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے قہر ٹپک رہا تھا ــــ انھوں نے کافی دیر کے بعد اپنا سر گھما کر کہا "آپ لوگ اندر کیوں نہیں چلتے؟ اپنے اردلی سے کہیے کہ وہ گھوڑوں کو چارہ کھلا دے" بچے تلے مضبوط قدم اٹھاتے اور زبان سے محتاط جملے ادا کرتے ہوئے وہ انھیں مویشی خانہ کی گیلری میں لے گئے۔

میں نے دیکھا کہ شام تک میجر اور کپتان اپنے میزبان کی پرانی دوستی اور محبت کو واپس لانے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہے۔ اُن کے سامنے ان کا میزبان بیٹھا ہوا تھا اور وہ سب گھوڑے کے بالوں سے بھری ہوئی لچکیلی کرسیوں پہ بیٹھے ہوئے وسکی کی چسکیاں بھر رہے تھے۔ ملازمت کے زمانے کے قصے چھیڑے ہوئے تھے مویشی خانہ کے ایک گوشہ سے بچوں کے کھیلنے اور شور مچانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر کھانے کے کمرہ میں سب نے مل کر کھانا کھایا۔ عجیب بات یہ ہے کہ کسی نے لوٹی بروٹن کا نام تک نہ لیا۔ حالانکہ یہ سب پر واضح تھا کہ لوٹی کا جانا اور دھوکا کھانا ایک خطرناک مذاق ہے۔ اور یہ کہ آباد کاروں کا ہمارے سبزہ زار پہ بھیڑ بکریوں کی طرح جمع ہونا اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

اس شام جب ان افسروں نے اپنے گھوڑوں کی ٹاپ گیلری کی طرف آتے ہوئے سُنی تو وہ دل میں یہ اطمینان لئے جلدی سے اٹھ گئے کہ وہ بخیریت اپنے

کیمپ میں واپس پہنچ جائیں گے۔ میرے چچا بھی کھڑے ہو گئے۔
"میجر صاحب میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ دستہ کس کے حکم سے میری زمین پہ متعین کیا گیا ہے؟"
"صدر مملکت کے حکم سے جناب کرنل صاحب!" میجر نے آہستہ سے کہا۔
"میرے چچا نے سنگ دلانہ طنز سے کہا" کیا صدر مملکت یہ چاہتے ہیں کہ آپ اور آپ کا دستہ میری زمین پر صرف کچھ عرصے کے لئے رہے"
"کرنل صاحب الحکم ثانی تک ہم یہیں رہیں گے" میجر نے کھنکارتے ہوئے اوپر دیکھا" اسکے باوجود مجھے امید ہے کہ آپ چاہیں تو ہم دوست رہ سکتے ہیں"
چچا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش ساکت و صامت کھڑے ہوئے تھے، ان کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ اور ان کی آنکھوں میں اس شخص کے خلاف نفرت کی چنگاریاں چمک رہی تھیں جس نے اپنی لڑائیاں لڑنے کے لئے دوسروں کو مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ اور خود بھُس میں چنگاری ڈال کر ایک طرف جا بیٹھا تھا میں اس زہر بھری تلخی کو محسوس کر رہا تھا۔ جو ان کے دل میں صحرا کی تپتی ہوئی آندھی کی طرح پرورش پا رہی تھی جو دیوار کے بڑے بڑے درختوں کو بھی آناً فاناً گرا دیتی ہے۔ آخر کار ان کی گردن اور ان کے ہاتھوں پر ابھری ہوئی نیلی رگیں بیٹھ گئیں۔ اور میں سمجھ گیا کہ غضب ناک طوفان فی الحال ملتوی ہو گیا ہے۔ یہ کہ وہ اپنے ہی ملک کے فوجی دستے کے خلاف لڑنے کے لئے اپنے آدمیوں کو نہ بھیجیں گے۔ اور یہ کہ وہ ان افسروں کو واپس بھیج کر ایک طرح ان کی تذلیل ہی کر رہے ہیں۔
جب وہ جانے لگے تو چچا نے بڑی رکھائی سے کہا" اچھا حضرات شب بخیر!

آپ آبادکاروں کو بچا سکتے ہیں لیکن سبزہ زار کو تو کوئی بھی نہیں بچا سکتا ۔"

اُن کے چلے جانے کے کافی دیر بعد تک وہ جون کی چاندنی میں جو درحقیقت دن کے اُجالے سے کم نہ تھی گیلری میں بے حس و حرکت کھڑے اپنے وسیع سبزہ زار کو دیکھتے رہے ۔ اور رات کو میں اپنی چارپائی پر لیٹا ہُوا کافی دیر تک جاگتا رہا اور اس سفید دُھند کو دیکھتا رہا جو بڑی کھڑکی کے سامنے پورے کمرہ میں بھر گئی تھی ۔ پورا سبزہ زار مجھے ہمیشہ کی طرح دُودھیا دُھند میں لپٹا ہوا نظر آ رہا تھا ۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ شاید میں اسے پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گا ۔ یہاں اتنی گھاس ہے کہ لمبی لمبی گھاس میری رانوں سے رگڑ کھاتی ہے ۔ اور چوزے اور پرندے میرے گھوڑے کے آگے بھاگتے ہیں ۔ یہاں کے نالوں میں خزاں کے موسم میں بھی اتنا پانی رہتا ہے جیسے ان میں آبشاریں آ کر گر رہی ہیں ۔ چچا کے ستر ہزار مویشی صبح شام گھاس چر کر ہی صحت مند اور موٹے تازے ہو گئے ہیں ۔ سردیوں میں برف کی پگڈنڈیوں پر ہر وقت کھیلنے کا لطف کہیں اور نہیں مل سکتا ۔ اور یہاں جنگل کی سوکھی گھاس کاٹ کر پورے سال کا چارہ اکٹھا کر لیا جاتا ہے ۔ اور جب موسم بہار میں یہاں کی دلدلوں پر سبزہ آتا ہے اور کچی گیلی مٹی کی سوندھ ہر طرف پھیلنے لگتی ہے اور غنچہ غنچہ کلی کلی آگ سی پھیلتی چلی جاتی ہے ۔ گھوڑے زمین پر لوٹتے اور چیختے ہیں ــــ تو کون ہے جو یہاں کے ایک ایک ذرے میں چھپے ہوئے ناقابلِ بیان سکون کو محسوس نہ کرے گا ـــ وہ گھاس کا سمندر !

۱۰۔ اور جب اگلی صبح میں نے حسبِ معمول سورج کو سبزہ زار کے مشرق میں طلوع ہوتے دیکھا تو مجھے بڑا تعجب ہوا۔ ناشتے کے وقت میں نے چچا سے کہا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں لال جھیل سے کچھ آدمیوں کو ساتھ لے کر اپنی گمشدہ کمیت گھوڑی کو ڈھونڈنے کے لئے مغرب میں ہو آؤں۔ انھوں نے اپنی کالی گہری آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے میری بات کی تہہ تک پہنچنا چاہا۔ اور وہ یقیناً سمجھ گئے تھے کہ میں کیوں نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا لیکن انھوں نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ اور جب ہم اپنی لال جھیل کے قریب پہنچے تو بارش شروع ہو گئی تھی۔

ساری رات خیمے کی چھت سے پانی ٹپکتا رہا تھا۔ ٹپ ٹپ کی آوازیں مجھے بری طرح ستاتی رہی تھیں معلوم ہوتا تھا کہ ٹپ ٹپ کی آوازیں میری سماعت کا جزو بن چکی ہیں۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میں جس چیز سے بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ وہاں بھی موجود تھی۔ بیلوں کے کیچڑ میں پیر جمانے کی آوازیں دلدلوں میں چلنے والے پہیوں کی چرخ چوں، مردوں کی حلق سے نکلی ہوئی بھاری آوازیں، عورتوں کی تیز لوکیلی چیخیں، شیر خوار بچوں کے رونے کی آوازیں، ٹوکروں میں بند مرغیوں اور دوسرے پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ، بھیڑوں اور بکریوں کا منمنانا اور آباد کاروں کا اپنے اجناس کو ادھر سے ادھر لے جانا اور شور مچانا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمارے علاقے پر ایک فتحیاب فوج کی طرح چھا چکے ہیں۔

اور دوسرے دن میں جب بادلِ ناخواستہ اپنے مویشی خانہ کی طرف واپس آ رہا تھا تو میں نے دور سے دیکھا کہ وہ ہمارے وسیع سبزہ زار کے ایک ایک چپے پر پھیلے ہوتے تھے۔ وہ خندقیں اور گھر بنانے کے لئے زمین میں گڑھے

کھودرہے تھے۔ دیوار کی موٹی موٹی لکڑیوں سے ایک چھپر سا بناکر اسے مٹی سے لیپ رہے تھے۔ اس جگہ پر خاردار تار بچھا رہے تھے۔ جہاں ہمارے مویشی اور گھوڑے اور جنگلی ہرن آزادی سے گھاس چرتے رہتے تھے۔ اور اپنے خچروں اور بچھڑوں کی مدد سے ہل چلاکر تازہ گھاس کی تہیں اکھیڑ رہے تھے۔ اور خوشی کے مارے چیخ رہے تھے۔

میں غصے میں کانپتا ہوا شام کے جھٹ پٹے میں اپنے مویشی خانہ کے وسیع ہال کمرے میں سے گزر کر نشست گاہ میں داخل ہوا تو مجھے اپنے آپ پر کچھ شرم آئی کہ میں اتنا بزدل کیوں ہوں اور میں نے کیوں بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ ابھی تک وہ اکھڑ اور مغلوب نہ ہونے والی شخصیت یعنی میرے چچا بڑے اطمینان سے چمڑے کی جلد کے کھاتوں اور روزنامچوں پر جھکے ہوئے تھے۔ اُن کے بڑے چہرے پر ابھی تک تکبر کے آثار موجود تھے، جیسے پچاس میل کے اندر اندر ایک آبادکار بھی نہیں ہے۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ انھوں نے قریبی کھلی ہوئی کھڑکی سے بن بستی کی دیوار سے پرے ان نصف درجن شمعوں کو دیکھ لیا ہے جو تاریک سبزہ زار میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلا رہی تھیں۔

اس شام اور آئندہ کئی شاموں کو میں پرانے مویشی خانہ کی اونچی اونچی دیواروں میں گھرا بیٹھا رہا۔ میرے چچا اپنے فولادی قلم سے کھاتوں میں کچھ لکھتے رہتے تھے۔ یا کینساس سے دو ہفتے پہلے کا آیا ہوا خط اپنے ہاتھوں میں بڑے اشتیاق سے کھڑکھڑاتے رہتے تھے۔ میرے چچا زاد بہن بھائی فرش پر بیٹھے پرانے رسالوں سے کاغذی گھوڑے اور مویشی کاٹتے رہتے تھے۔ اور چاروں

طرف پڑے ہوئے مانوس پردے، فرنیچر، لیمپ کی روشنی میں جگمگاتا ہوا قالین مجھے ہردم یہ احساس دلاتا رہتا تھا کہ لوٹی بیروٹن اب بھی یہاں موجود ہے اور ایک دفعہ جب لوٹی کے پڑھے ہوئے پرانے رسالوں میں سے ایک رسالے سے عطر کی ہلکی ہلکی خوشبو اُٹھ کر سارے کمرے میں پھیل گئی تو میں قسمیہ کہتا ہوں کہ مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ میرے پیچھے کھڑی ہوئی ہے۔ وہی زندگی، وہی بشاشت، وہی چمک دمک اور جیسے وہ اپنی تیز، واضح توکیلی اور سرور انگیز آواز میں بولنے ہی والی ہے اور جیسے وہ ابھی اپنی مخصوص آواز میں اپنے بچوں کو پکارنے والی ہے۔

چند دنوں کے بعد بلیک ہیٹی نے گویا مجھے ایک بڑی فال سنانے کے لئے چپکے سے کہا "ہال صاحب! سنا ہے ان کی گاڑیاں روز بروز ہماری طرف بڑھ رہی ہیں۔ اب مسز بیروٹن بہت جلد واپس آجائیں گی اب وہ تنہا نہیں رہ سکتیں۔ کیوں جناب آپ چند روز اور ٹھہریں، آپ کو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ میں جھوٹ کہتی ہوں یا سچ!"

میں نے دل میں غصہ محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ ہاں تو سچ کہتی ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اب ہم اس دور افتادہ پُرامن مویشی خانہ میں تنہا نہیں رہ سکتے۔ ہمارے مویشی خانہ سے قریب ترین بستی بھی چالیس پچاس میل کے فاصلے پر تھی۔ کمرہ کی کھلی ہوئی کھڑکیوں سے آبادکاروں کے باڑے، جنگلے، جُتے ہوئے کھیت اور کھائیاں اور لیپی ہوئی چمنیوں سے اُٹھتا ہوا دھواں صاف نظر آتا تھا۔ تقریباً ہر روز کچھ آبادکار اپنی اسپرنگ دار گاڑیوں میں بیٹھ کر قصبے میں آتے

تھے یا دوسری طرف کے آبادکاروں سے ملنے جاتے تھے، اور اب تو ان کے بچے بھی بوڑھی گھوڑیوں پر چڑھ کر، پاپس یا بسکٹ یا بیمار گائے کو کھلانے کے لئے سوڈا وغیرہ خریدنے کے لئے قصبہ میں آنے لگے تھے۔

وہ مویشی خانہ کے پاس سے بچ کر یوں نکلتے تھے جیسے یہاں کوئی وبائی بیماری پھیلی ہوئی ہو۔ ننھا جمؔی اور سادہ بیٹ بن سٹی کی دیوار کے پاس خاموش کھڑے ہوئے انھیں جاتا دیکھتے رہتے، لیکن براک جس کے بال پیشانی پر سے سیدھے پیچھے کو جاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، سیدھا ان بچوں کے پاس دوڑ کر جاتا تھا اور انھیں ٹھہرانے کی کوشش کرتا تھا تاکہ وہ ان کے ساتھ کھیل سکے۔

اس بات سے مجھے فوراً وہ وقت یاد آجاتا جب لوٹی بروٹن دوڑ کر آبادکاروں کے بچوں کے پاس گئی تھی اور ان سے ہنس ہنس کر باتیں کی تھیں حالانکہ اب بچوں کی یہ نئی نسل پہلی نسل سے کافی مختلف تھی۔ گم سُم، حیران و متجسّس، سرکش مگر کچھ ڈری ڈری سی، جونہی وہ گاڑی کے پہیئے پر پاؤں رکھ کر گھوڑیوں پر چڑھتے، دیکھتے دیکھتے غائب ہو جاتے۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ اگر لوٹی بروٹن ہوتی تو وہ انھیں بہلا پھسلا کر روک لیتی۔ ان کے ساتھ باتیں کرتی۔ انھیں ہنساتی اور خود بھی ہنستی۔ انھیں لیموں کا شربت پلاتی۔ اور جمہوری کیک کا ٹکڑا کھلاتی۔

ایک دفعہ جب آبادکاروں کے بچے قصبے میں آئے ہوئے تھے، اور اس وقت گودام کے پاس تھے تو اتفاق سے چچا کہیں سے گھوڑے پر چڑھے آ گئے۔ بچے فوراً ایک جگہ جمع ہو گئے۔ جیسے انھوں نے کوئی ایسا آدم خور جن دیکھ لیا ہے جو ان کی خریدی ہوئی چیزیں چھین کر نگل جائے گا۔ لیکن چچا نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں۔

اور اگر دیکھا تو اس کا اظہار قطعاً نہ ہونے دیا۔ جب وہ مویشی خانے میں آئے تو میں نے ان کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک دیکھی جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ آج کسی آنے والے کی توقع کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کل (ہمیشہ کی طرح کل) ہم دیکھیں گے کہ لوٹی، فرینگ ڈیگبیٹ کے اصطبل سے لی ہوئی ایک بگھی میں مویشی خانہ میں اس طرح داخل ہو رہی ہو گی جیسے وہ پہلی بار اس قصبے میں آئی ہے۔ ڈیگبیٹ خود بھی بڑا خوش اور مغرور نظر آرہا ہوگا۔ اور کرنل کی نظروں میں مزید چڑھنے کے لئے کچھ عاجزی سے کام لے رہا ہوگا۔ میرے چچا کا چہرہ ایک دم اداس اور سنجیدہ ہو جائے گا۔ اور وہ ہمیشہ کی طرح بڑے اخلاق اور شستگی سے لوٹی سے اس کی خیریت اور صحت وغیرہ کے متعلق باتیں کریں گے۔ اور اس بارے میں اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالیں گے کہ وہ اس عرصے میں کہاں کہاں رہی۔ اور نہ وہ اس بے وفا شخص کے متعلق ہی کچھ کہیں گے جس نے اسے دھوکا دیا تھا۔ اور جب وہ اپنے بچوں کو پکارا کرے گی تو پھر ہمارے کارندے روزانہ اس کی تیز، اونچی، لوکیلی آواز سن کر مچلا کریں گے۔

لیکن، جولائی بھی گزر گیا۔ اور اس کے بعد اگست بھی، اور جس روز مجھے واپس اپنے کالج جانا تھا، اس سے ایک روز پہلے رات کے وقت چچا نے مجھے اپنے سونے کے کمرے میں بلایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے یہی کہیں گے کہ میں سینٹ لوئی کی کونونٹ میں مسز سیڈیز نامی نن سے ضرور ملوں اور اس سے لوٹی بریڈن کا اتا پتا پوچھوں۔ لیکن انھوں نے لوٹی کا نام تک نہ لیا۔ ایک دفعہ ان کی نگاہ اتفاقاً لوٹی کے میلے کچیلے دستانے پر جا پڑی جو اس کے نازک، حسّاس اور نسوانی وجود کے ایک حصے

کی حیثیت سے الماری پر پھیلا ہوا پڑا تھا، ان کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ریڈ انڈین لوگوں کے مقدس الاؤ کی سی آگ دہک رہی تھی - جیسے مذہبیاً کبھی نہیں بجھنے دیا جاتا۔ میں ساری رات یہ محسوس کرتا رہا تھا کہ جیسے وہ تصوّر ہی تصوّر میں راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں کو ہلا رہے ہیں اور الاؤ پر تازہ لکڑیاں ڈال رہے ہیں۔

اور میں رات بھر اپنے چچا کے ان اندرونی جذبات کو خود محسوس کرتا رہا کہ لوئی پمروٹن جہاں کہیں بھی ہے اس کا سفید ہاتھ الماری پر پڑے ہوئے دستانے کی طرح پھیلا ہوا ہوگا۔ ذلت محسوس کر رہا ہوگا۔ اس ہاتھ کی بے عزتی کی جا رہی ہوگی۔ اور یہ کہ وہ اب کبھی اس مویشی خانہ اور قصبے میں نہیں آئے گی جہاں اس کی پوجا ہونے لگی تھی حتیٰ کہ وہ اپنے بچوں کے لئے بھی نہیں آئے گی۔

۱۱ — تین سال کی طویل مدت تک جس کا ایک حصہ میں نے میڈیکل سکول میں گزارا، میں نے اس عظیم الشان مویشی خانے یا وہاں کی مٹی کے ایک ذرّے یا وہاں کی گھاس کی ایک پتی کو بھی نہیں دیکھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان دنوں سینٹ لوئی کا موسم ہمیشہ کی طرح خشک رہتا تھا اور دریائے مس سس پی کسی منہ زور گھوڑے کی طرح بار بار شہر پر چڑھا آتا تھا۔ لیکن ادھر سالٹ فورک کے ہفتہ وار اخبار میں موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ یہ خبریں آ رہی تھیں کہ کینساس کے مغرب میں زبردست بارش ہو رہی ہے اور خلافِ معمول یہ ژالہ باری بھی بہت شدید ہے۔ علاقے کی

تمام چراگاہوں میں پانی کھڑا رہتا ہے اور اس وقت تک نہیں سوکھتا جب تک کہ وہاں کوہ طور کی طرح بہار نہیں آجاتی۔ اور پھول نہیں کھل اٹھتے۔ ہوتے ہوتے جب اس اخبار کا ہر شمارہ آبادکاروں کی اور زیادہ خبریں لانے لگا جنہیں وہ پناہ گزیں، آبادکار، آبادی کے متلاشی کھیتی باڑی کرنے والے کاشت کار اور زراعت پیشہ کے مختلف ناموں سے پکارتا تھا۔ اور ہمارے چراگاہوں اور گوالوں کی خبریں بتدریج کم آنے لگیں۔ تو تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلے پر میرے انگوٹھے غصے میں آکر اس اخبار کو بری طرح مسل دیتے۔

گاڑیوں اور ٹرینوں کے ذریعے مزید آبادکار سالٹ فورک میں آبسے تھے۔ آبادکار دفتر زراعت کے گرد جمع رہتے تھے۔ آبادکار سبزہ زار کی زرخیز، بھوری چکنی مٹی میں ہل چلا رہے تھے۔ آبادکار کھیتوں کی نلائی کر رہے تھے اور ہل چلائی ہوئی زمین پر سراون پھیر رہے تھے۔ قصبہ کے اصل باشندے سالٹ فورک کی ریتلی پہاڑیوں پر چڑھ کر دور دور تک آبادکاروں کے لہلہاتے ہوئے گیہوں کے کھیتوں کو دیکھا کرتے تھے۔ جب خوب موسلادھار بارش ہوئی تو جج چیمبرلین نے کہا کہ اس سے تو یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا بھی آبادکاروں کا طرفدار ہے۔ آبادکاروں کے گیہوں کی سنہری بالیاں دھوپ میں خوب چمکتی تھیں۔ آبادکاروں کے ہیبٹ کھڑی ہوئی فصل کی بالوں یا کانٹوں میں الجھ کر سر سے گر پڑتے تھے۔ آبادکاروں کی فصل اتنی گھنی تھی کہ اگر اس میں کوئی گھڑسوار گھستا تو گھوڑا بھی غائب ہو جاتا۔ اور اس کا سوار بھی!

ادھر اخبار یہ خبریں لا رہا تھا۔ ادھر میرے چچا کے خطوط کی کسی سطر سے

یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے سبزہ زار میں کسی ایک آبادکار کا بھی وجود ہے۔ ان کے خط ہمیشہ کی طرح مختصر ہوتے تھے لیکن ان کے الفاظ میں ابھی تک روح بھری ہوئی تھی۔ وہی سیدھے اور روشن الفاظ جو مٹائے نہ مٹ سکتے تھے۔ ہر لفظ کا آخری حرف ایک ہیجانی کیفیت میں گھٹتا ہوا۔ ہر اسم معرفہ کے نیچے ایک لکیر کھنچی ہوئی۔ اس پر تاکید کرنے کے لئے نہیں۔ بلکہ محض ارادے اور قوت کی زیادتی کی علامت کے طور پر۔

ان کے خطوط مجھے باقاعدگی سے ملتے تھے۔ وہ ہر خط میں یہی لکھتے تھے کہ اب کے گھاس بہت عمدہ ہے۔ کھانے والے مویشیوں کی صحت بہت عمدہ ہے۔ میری کمیت گھوڑی کے ایک لال بچھیرا پیدا ہوا ہے۔ کارندے اور چچا زاد بھائی بہن بہت بہت سلام کہتے ہیں۔ وہ ٹھہرے میرے چچا برونٹن انھوں نے کبھی اصل بات نہ بتائی۔ البتہ مجھے دوسرے ذرائع سے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ ان کی اپنی چہیتی گھوڑی پوپیائی ایک دفعہ گر پڑی تھی اور چچا آبادکاروں کے لگائے ہوئے خاردار تاروں میں الجھ گئے تھے۔ ان پر گولیاں چلائی گئیں لیکن وہ خوش قسمتی سے بچ نکلے، یہ کہ ان کے گوالے ان گڑھوں کو کھود رہے تھے جن میں فلبوح بچھڑوں کی ہڈیاں اور سینگ دفن تھے جن کے متعلق یہ روایت تھی کہ مصیبت کے وقت انھیں باہر نکالا جائے تو مصیبت ٹل جاتی ہے، اور یہ کہ بیسیوں آبادکار مل جل کر ان کے خلاف جج چیمبرلین کی عدالت میں یہ مقدمہ چلا رہے ہیں کہ ان کے مویشیوں نے ان کی کھڑی فصلوں اور باغوں کو تباہ کر دیا ہے۔

میرا خیال تھا کہ جب میں گھر پہنچوں گا تو مقدمہ ختم ہو چکا ہوگا۔ لیکن جب میں جولائی کے آغاز میں ٹرین سے اترا تو میں نے دیکھا کہ سالٹ فورک میں

زبردست چہل پہل تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج آبادکاروں کا یوم تعطیل ہے۔ غلے سے بھری ہوئی گاڑیاں چوک میں کھڑی تھیں اور تختوں کی پٹڑیوں پر لوگوں کا زبردست ہجوم تھا جن میں سے ہر ایک اپنی گیہوں اور روئی کی بھری ہوئی بوری کی طرح موٹا اور ہٹا کٹا تھا۔ وہ لوگ ہمارے گوالوں سے بالکل مختلف تھے۔ ان میں وہی فرق تھا جو وہ ڑنے والے طاقتور گھوڑے اور سواری کے نازک ٹٹو میں ہوتا ہے۔ ہر جگہ، ہر کہیں، ہر دکان دار ان کی عورتوں سے ہنس ہنس کر ایسی عاجزی سے پیش آ رہا تھا جو وہ اب تک (میرے خیال کے مطابق) صرف ہمارے گوالوں اور چرواہوں کے لئے مخصوص رکھتے تھے۔

میں پرانے ایکس چینج ہاؤس کی سیڑھیوں پر کھڑا ہوا تھا۔ اور مجھے بمشکل یہ یقین آ رہا تھا کہ یہ وہی چوک ہے جس پر میں چند سال پہلے بری طرح فریفتہ ہو گیا تھا اور اس کی خاطر میں نے بڑے بڑے شہروں سے نفرت کی تھی۔ میں نے جج چیمبرلین کی نئی عدالت میں، جہاں پہلے کلانسی کی رقص گاہ ہوا کرتی تھی اپنے چچا کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ یہ وہ عدالت تو نہ تھی جو کبھی قصبہ ہالٹ فورک کی ہوا کرتی تھی اب ملزموں کے کٹہرے کے دونوں طرف بکسوؤں سے کسے ہوئے خنجر نہ لٹکے ہوئے تھے۔ فرش دیوار کے تختوں کا بنا ہوا تھا۔ بیٹھنے کے لئے تکیہ دار بنچ بچھا دئے گئے تھے۔ اور تمام احمق تماشائی ایسے تقدس سے کھڑے ہوئے تھے جیسے وہ گرجا میں ہوں۔ دراز قد برائس چیمبرلین عدالت میں داخل ہوا۔ اس کے چمکتے ہوئے سنہری بال اس کے کالے گاؤن کے ساتھ لگا کھا کر اور بھی خوبصورت لگ رہے تھے۔ وہاں سے ہنری میکرٹن بھی جا چکا تھا۔ اپنے ابھرے ہوئے رخساروں

اور دھنسی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس نے میرے چچا کا مقدمہ ایک ایسے آدمی کی طرح لڑا تھا جس پر فالج کا پہلا حملہ ہو چکا ہو اور اب وہ دوسرے حملہ سے بچاؤ کی تیاری کرنے کے لئے یہاں سے جا چکا ہو۔

جب میرے چچا عدالت میں داخل ہوئے تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ بس اب مقدمہ کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ ان سُست چہرے والے غبی انسانوں نے اس متکبر شخص کی آمد پر جو درمیانی نشستوں کو چیر کر آگے بڑھا تھا۔ اس بات کے سوا اور کوئی اظہار نہ کیا کہ ان کی آنکھوں سے حقارت ٹپک رہی تھی۔ اور وہ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے تھے۔

میں نے شروع شروع کی عدالتی کارروائی کو سننے کی پوری کوشش نہیں کی۔ لیکن جب برائس چیمبرلین نے بولنا شروع کیا تو میں پوری طرح متوجہ ہو گیا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گائے چرانے والے کو دھمکا رہا ہے۔ اس نے میرے چچا کے خلاف پیش کردہ گواہیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جیوری کو حکم دیا کہ وہ اپنے فیصلے میں میرے چچا کو ضرور قابل سزا گردانیں اور نقصان کا ہرجانہ مقرر کریں۔ مجھے بارہ یا چودہ سال پہلے کا وہ دن یاد آ رہا تھا جب محض اتنی سی سرگوشی سے کہ مویشی خانہ کا مالک عدالت کی طرف آ رہا ہے۔ لوگ ڈر کے مارے لرزنے لگے تھے۔ اور جب چچا درمیانی نشستوں میں سے گزرتے ہوئے کٹہرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جیسے ان کا حق جج و آنٹ کے حق سے کچھ کم نہ ہو، تو پوری عدالت میں غضب کی خاموشی چھا گئی تھی۔ اور ہر ایک کو ان کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ ان دنوں سرکش گھوڑے سے بھی چچا کی لگام تلے اس

تیزی سے دوڑتے تھے کہ انھیں ہوا بھی نہیں پکڑ سکتی تھی۔

پہلے لوئی برونٹن گئی اور اب گھاس کا سمندر بھی ان کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔ اور اب یہ لوگ جو اس علاقے کے محفوظ ہونے تک اپنی جگہ پر رہے تھے اور انھوں نے پہلے آکر یہاں کی سختیاں جھیلنا گوارا نہ کی تھیں کتوں کی طرح بھونک رہے تھے۔ اور میرے چچا کی ٹانگوں سے لپٹے ہوئے تھے جنھوں نے اس بنجر علاقے میں سب سے پہلے آکر اسے آباد کیا تھا۔ وہ اپنے پنجوں سے ان کے جسم سے کبھی اس حصّے کا گوشت کاٹ رہے تھے۔ کبھی اس حصّے کی بوٹیاں نوچ رہے تھے لیکن جب چچا نے اپنے اسی پرانے، نڈر اور ناقابلِ شکست انداز میں اپنی جگہ پہ بیٹھے چاروں طرف کے آبادکاروں کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ اگرچہ وہ مقدمہ ہار گئے ہیں لیکن آبادکار انھیں شکست نہیں دے سکے ہیں۔

مجھے اپنی جگہ پر سے صرف ان کا سر نظر آرہا تھا جو ان چھوٹے چھوٹے احمق سروں میں کسی دیوتا کا سر معلوم ہوتا تھا۔ برائس چیمبرلین کی طرف دیکھتے ہوئے ان کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی لال لال چنگاریاں پھر جل اٹھی تھیں۔ برائس کو اس کا احساس ہوا یا نہ ہوا اسے ابھی چچا کا ایک قرضہ تو چکانا تھا۔ ممکن ہے کہ وقت بدل جائے، لیکن میرے چچا کبھی نہیں بدلیں گے۔ وہ برائس سے اپنا قرضہ لینا کبھی نہیں بھولیں گے ـــ مرتے دم تک نہیں بھولیں گے۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں عدالت کی سیڑھیاں اتر کر گلی میں آیا تھا تو مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ چچا کے ساتھ ان کے دونوں بیٹے بھی عدالت میں ہیں۔ جب

براک نے مجھے دیکھا تو اس نے جمّی کا ہیٹ سر سے اتارا اور اسے ہوا میں اچھالتا ہُوا تختوں والی پٹڑی پر دوڑنے لگا۔ میں اُسے پکڑنے ہی والا تھا کہ اس نے ہیٹ ایک آباد کار کی گاڑی کی طرف پھینکا۔ جو گیہوں کی بوریوں سے لدی ہوئی کھڑی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے ہیٹ نیلے آسمان کے پس منظر کے ساتھ ہوا میں اچھلا، پھر نیچے آتے وقت گاڑی میں گرنے کے بجائے کیچڑ میں جا گرا۔

اس رات مجھے اس بات کا خیال تک نہ آیا تھا کہ یہ ساکن نیلا آسمان اپنی پُراسرار گردش پوری کر کے واپس پلٹ رہا ہے، یہ کہ وہ کیچڑ سالٹ فورک کی آخری کیچڑ اور گیہوں کی بوریوں سے لدی ہوئی وہ گاڑی سالٹ فورک کی آخری گاڑی ثابت ہوگی۔ وہی سالٹ فورک جسے لال جھیل کے شمال میں بسنے والے باشندے برف کی سرزمین کہتے تھے۔

۱۲ — اس وقت تو میں یہ سمجھا تھا کہ یہ محض اتفاق کی بات ہے۔ یہ کہ تاش کا کھیل اسی طرح کھیلا جاتا ہے جس کے پاس اچھے پتّے اتفاقاً آجاتے ہیں وہ بُرے پتّے والوں کو پیٹ لیتا ہے۔ لیکن اب جب میں ماضی کی طرف مُڑ کر دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے وہ سب کچھ توریت کی کتاب پیدائش یا کتاب خروج کے حروف کی طرح ناقابلِ تغیر اور اَن مٹ تھا۔ یعنی یہی کہ آباد کار اپنی

تھا کہ جنت میں پہنچ کر مامون و محفوظ ہو جائیں - اور میرے چچا اپنے پہاڑیوں پر پھیلے ہوئے ہزاروں مویشیوں سمیت پیچھے ہٹتے چلے جائیں۔ برائس چیمبرلین کو اعلیٰ سے اعلیٰ کرسی پر بیٹھنے کا پُرجلال مرتبہ ملے، اور قدرت جلتی ہوئی جھاڑی کے پیچھے چھپی ہوئی اپنی خشم آلود آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھتی رہے - اور یہ نہ دیکھے کہ بعد میں جو کچھ ہونے والا ہے، وہ قانونِ ارتقاء کے مطابق ہمدردی اور رحم دلی پر مبنی ہوگا یا نہیں، شیریں اور لذیذ ہوگا یا نہیں - اور دیکھے تو صرف یہ دیکھے کہ جو کچھ ہونے والا ہے۔ اسے کتابِ تقدیر میں لکھے ہوئے اصولوں کے مطابق انصاف اور صداقت پر مبنی ہونا چاہیئے - تقدیر تو انسان کو اندھا کر دیتی ہے اور اپنی کتاب صحیح طور پر کسی کو نہیں پڑھنے دیتی - تاوقتیکہ وہ لوگ جو اس کتاب کی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتے ہیں مر نہ جائیں اور ہزاروں سال کا زمانہ نہ گزر جائیں۔

جب میں نے یہ خبر سُنی کہ کینساس اور ریڈ انڈین علاقہ کے مغربی حصے میں موسم تبدیل ہو گیا ہے۔ تو مجھے یوں لگا جیسے خدا جس پر ہم طلب کے چند ہی طلبا اعتقاد رکھتے تھے۔ آخر کار اپنی کرسیٔ معلّی پر آ بیٹھا ہے۔ اور جیسے میری آنکھیں اسکول اور ہسپتال کے تاریک کمروں میں خوشی سے چمک اُٹھی ہیں۔ آبادکاروں کی عورتیں بارش کے لئے دعائیں مانگ رہی تھیں اور مرد میرے چچا کے تالابوں اور پون چکیوں سے پانی چرا چرا کر لے جاتے تھے۔ وہ آبادکار جن میں ذمہ داری کا مادہ زیادہ تھا، اپنا سامان باندھ کر مغرب اور شمال کی طرف جانے لگے تھے۔ اور کچھ مارمن قبیلے کی طرف رُخ کر رہے

تھے۔ برائس چیمبرلین نے اپنے ۴ر جولائی کے خطبے میں انکشاف کیا کہ اس سے ہوا کی تاریخ میں یہ خشک سالی سب سے بڑی اور خطرناک ہے۔ لیکن ہفتہ وقتیا اخبار میں ایک خط جس کے نیچے "گوالا" لکھا ہوا تھا اس مضمون کا شائع ہوا تھا کہ یہ خشک سالی قطعاً نہیں ہے بلکہ نیو میکسیکو کا موسم ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ خط میں اِن میدانوں کا بھی ذکر کیا گیا تھا جہاں خودرَو جنگلی گھاس میلوں تک کھڑی تھی۔ اور جہاں ابھی تک ہل نہیں چلایا گیا تھا۔ اس میں یہ حوالہ بھی دیا گیا تھا کہ اس بنجر زمین میں گوالوں نے اپنے طویل تجربے اور سخت محنت کی بدولت خشک سالی پر قابو پالیا ہے۔ اور وہاں ان کی فصل کے بیج پھوٹ آئے ہیں۔ اور ادھر آباد کاروں کے گیہوں کے بیج زمین ہی میں دفن ہو کر رہ گئے ہیں۔

اگلے موسم بہار میں جب میری ٹرین مسوری اور مشرقی کینساس کے علاقوں سے گزر رہی تھی تو دودھیا دھند کے مرغولے ٹرین کی کھڑکیوں کے شیشے پر آکر لگتے تھے۔ لیکن جب ٹرین اونچی چٹانوں پر چڑھ گئی تو کھڑکیوں سے باہر کا منظر صاف صاف دکھائی دینے لگا۔ آسمان ہمیشہ کی طرح نیلا تھا اور بھوری زمین پہ ہری ہری گھاس لہلہا رہی تھی۔ اور جب ٹرین سالٹ فورک کے قریب پہنچی تو میں نے چونک کر دیکھا کہ گرد سبزہ زار کے اوپر چکر کھاتی ہوئی اُڑ رہی تھی اور آباد کار بنجر زمین میں ہل چلا رہے تھے اور ہل چلائی ہوئی زمین میں اون بکھیر رہے تھے۔

جب میں بس کا ٹکٹ لے گیا تھا۔ میں نے اپنے چچا کو نہ دیکھا تھا۔ اور میرا خیال

تھا کہ وہ قدرت کی اس حمایت کی بناپر فتح کے نشے میں سرشار ہو رہے ہوں گے
میں اس جانے پہچانے سرخ ڈپو کے پاس ٹرین سے اترا۔ وہ مجھے لینے کے لئے
خود ایک بگھی میں آئے تھے۔ میں ان کے احساسات بالکل نہ سمجھ سکا۔ اُن کے
بڑے چہرے پر جیسے ہل چلا ہوا تھا اور سراون پھرا ہوا تھا۔ ان کی مونچھیں
سفید ہو گئی تھیں۔ لیکن ان کی آنکھوں میں اب بھی وہ غصے کی لال لال چنگاریاں
موجود تھیں جنھیں میں ہمیشہ دیکھتا آیا تھا۔ گھر جاتے وقت ہم اس راستے سے
گزرے جو کبھی اُن کا اپنا زرخیز علاقہ تھا۔ اور اب وہ محض ایک ضائع شدہ
قطعہ اراضی تھا جس کے چاروں طرف خاردار تار لگے ہوئے تھے۔ بیچ میں
خالی زمین پڑی ہوئی تھی۔ اور کہیں کہیں خود بخود کھلنے اور بند ہونے والے
ٹوٹے ہوئے دروازے تھے۔ کہیں کہیں خندقیں کھدی ہوئی تھیں۔ کبھی
کبھی مرتے ہوئے نئے پھل دار درختوں میں سے کسی پرندے کے گانے کی
آواز بھی آجاتی تھی۔ جو علاقے کی ویرانی کا مذاق اڑاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے
اب تک یاد ہے کہ جب راستے میں ایک میلے کچیلے آبادکار نے ان کی زمین کے
ایک بنجر ٹکڑے کو خریدنے کی پیش کش کی تھی۔ تو وہ اپنی بگھی میں بالکل خاموش اور
بے حس وحرکت بیٹھے رہے تھے۔

ہم رات کے اندھیرے میں گھر پہنچے۔ بن سٹی کی دیوار اور پھلواریوں کے
سایہ کے پیچھے، دُور تاریک گہرائیوں میں مویشی خانہ ایک ایسے فراموش شدہ قلعے
کی طرح کھڑا تھا جس کا قدیم جاہ وجلال آہستہ آہستہ مٹ رہا تھا۔ سارہ بٹ
کو مشرق میں ایک کونونٹ اسکول میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ دونوں لڑکے

اپنی اپنی چارپائی پر گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ میرے چچا کی عدم موجودگی میں موسم بہار کی تیز ہواؤں نے آباد کاروں کے کھیتوں سے اڑائی ہوئی گرد دیواروں پر اس طرح جمادی تھی کہ پکی اینٹیں نظر ہی نہ آتی تھیں۔

اس رات کھانا کھانے کے لئے ہم بڑی میز پر بیٹھے جس پر نہ آج کپڑا تھا نہ موم بتیاں تھیں۔ ہمارے سروں پر جلتے ہوئے پیتل کے لیمپ سے دھندلی روشنی میز پر پڑ رہی تھی۔ کھانا کھا کر میں ہال کمرے میں گیا جہاں کئی روز سے صفائی نہیں کی گئی تھی۔ پھر خاموش نشست گاہ میں گیا۔ جہاں فرش پر بچوں کی ڈوریاں، چھوٹی چھوٹی رائفلیں، لگامیں اور گدیاں بکھری پڑی تھیں اور کونے میں رکھے ہوئے پیانو کے گرد آلود ڈھکنے پر بچوں کی انگلیوں کے نشان تھے۔ دوسرے دن صبح میں نے نشست گاہ میں دونوں بچوں کو لڑتے ہوئے دیکھا جو وحشیوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے۔ اور پھر وہ تھک ہار کر اپنے ٹٹو پر چڑھ کر کھیتوں میں چلے گئے۔ سارا وقت مجھے یہ عجیب و غریب بات سوچ کر حیرانی ہوتی رہی کہ کیا کبھی اس گھر میں کوئی عورت بھی آئی تھی۔

"وہ آئی بھی اور چلی بھی گئی۔ اور میرے چچا کے سوا اور کوئی اسے یاد نہیں کرتا۔"

میں نے اپنے کمرے سے اٹھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ یہاں ایک دفعہ اس عورت نے اپنے نرم و نازک اور سفید ہاتھوں سے مجھے چمکارا تھا۔

لیکن جب میں ان ریتلی پہاڑیوں پر، اپنے کارندوں کے خیموں میں گیا جہاں کہیں دیوار کے درخت کھڑے ہوئے تھے۔ اور جہاں ابھی آباد کاروں کی نظر نہ گئی تھی۔ تو اتفاق سے میں نے لوئی کی پرانی واقف عورتوں میں سے ایک سے اس کے بارے میں گفتگو کی۔ یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ ابھی تک اُن لوگوں میں کرنل براوٹن کی خوبصورت بیوی کے چرچے ہیں۔

چند لوگوں کا یہ خیال بھی تھا کہ وہ اس کا اتا پتا جانتے ہیں۔ نوجوان مسٹر لوب کنگ مین نے کہا میں نے لوئی براوٹن کو لاہیہ کی نقاب پہنے بیوادرلینیز کی سڑکوں پر دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت اور جوان تھا۔ شراب خانہ نمبر ۴۴ کے شریف النفس ڈرائیور نے کہا کہ میں نے خود لوئی کے رفیق کی حیثیت سے ٹوم اسٹون کے قمار خانہ میں جوا کھیلا تھا۔ اور ہم دونوں نے انعام جیتا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا نہایت عمدہ اور بھڑکیلا گاؤن پہن رکھا تھا۔ اور وہ ہر پانسے میں بیش قیمت جواہرات لگاتی تھی۔ اس نے کسی رقص گاہ میں ناچنے والی عورت کی طرح غازہ تھوپ رکھا تھا اور ہونٹوں پر سُرخی لگائی ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے یہ بھی بتایا کہ وہ جوا کھیلتے وقت بڑی مضطرب اور پریشان سی تھی۔ اور اس کی ایک ایک حرکت سے اس کی پریشانی عیاں تھی۔ جان میکنڈلس نے جو ایک مشہور کمپنی کا ایجنٹ ہے۔ بتایا کہ میں ایک کاروباری سلسلے میں واشنگٹن گیا تھا۔ وہاں میں نے لوئی کو ایک کھلی گاڑی میں میں بڑی سایہ دار سڑک پر سے گزرتے دیکھا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک غیرملکی سفیر یا کوئی اور عہدہ دار بیٹھا ہوا تھا۔ جس کے کوٹ پر تمغے اور فیتے لگے ہوئے

تھے۔ اگر گاڑی ٹھہری ہوئی ہوتی تو میں اس کا اتا پتا ضرور پوچھتا۔ جان میکنڈلس کہتا تھا کہ جب میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے اپنا منہ پھیر لیا۔ منہ پھیر لینے پر میں سمجھا کہ ہو نہ ہو یہ تو مسز برونٹن ہیں۔

مائرا ہینڈرووڈ کا خیال تھا کہ لوٹی مر چکی ہے۔ لیکن وہ کہانی جو ریل کے سپرنٹنڈنٹ نے مجھے سنائی میرے نزدیک زیادہ قرین قیاس تھی۔ اس لئے کہ وہ اس رقص گاہ میں خود موجود تھا جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ یہ رقص گاہ کولوریڈو کی چاندی کی کان کے نیچے واقع تھی۔ اس کا فرش موم کا بنا ہوا تھا۔ اور چھت پر ایک اب روک چھتری تنی ہوئی تھی۔ مکمل آرکسٹرا اپنی پوری طاقت سے بج رہا تھا۔ شام کے وقت اچانک کہیں قریب ہی سے کسی چٹان کے گرنے کا دھماکا ہوا۔ تمام ناچنے والے ناچتے ناچتے دم بخود ہو گئے۔ لیکن ایک عورت بالکل نہ ڈری۔ اس کا اصل نام تو مسز برونٹن تھا مگر فی الوقت اس نے اپنا کوئی اور نام رکھا ہوا تھا۔ چٹانیں برابر کئی منٹ تک گرتی رہیں۔ لیکن وہ عورت عجیب سرشاری میں اپنے رفیق کے ساتھ ناچتی رہی۔ آرکسٹرا بجانے والوں کو ہمت دلاتی رہی اور اپنے رفیق کو ناچتے پر اکساتی رہی۔ اور اس طرح قہقہے لگاتی رہی جیسے کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ جب چٹانیں گرنی بند ہو گئیں اور لوگوں کا خوف دور ہوا تو وہ لوٹی کے جوش کی ترغیب میں آ کر دوبارہ رقص گاہ کے فرش پر آ گئے۔ یہ کہانی سن کر مجھے محسوس ہوا تھا کہ اصل لوٹی برونٹن تو یہ تھی۔ لوٹی کو دیکھ کر ہمیشہ جو خاص جذبہ میں محسوس کیا کرتا تھا وہ ناقابل بیان حد تک پھر مجھ پر طاری ہو گیا۔

لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ لوگ اس کے متعلق اور بھی باتیں کرتے ہیں۔ جو انھوں نے مجھے نہ بتائی تھیں۔ سچی بات یہ ہے کہ لوئی بروٹن کے متعلق جتنی زیادہ رومانی باتیں کی جائیں جتنی زیادہ مبالغہ آرائی کی جائے کم ہے۔

ایک خاص بات جسے میں نے پہلے پہل محسوس کیا یہ تھی کہ جب میں برک کو اپنے ساتھ قصبے میں لے جاتا تھا تو وہاں کے لوگ اس سے بڑی دل چسپی لیتے تھے وہ ہر بات کا جواب چٹکیوں میں دیتا تھا اور بات بات پر لوگوں سے الجھنے لگتا تھا۔ اور لوگ اس کی نیم طرار باتوں پر ہنستے رہ جاتے تھے۔ اور جب عورتیں اس کے ملائم سنہری بالوں کی تعریف کر رہی ہوتیں۔ اور اسے کیک کے ٹکڑے کھلا رہی ہوتیں۔ اور مرد اسے قصبہ کے مشہور لوگوں کی طرح اکڑ کر چلنے اور ان کی نقلیں اتارنے کی ترغیب دے رہے ہوتے، تو میں یہ دیکھتا کہ وہ ساتھ کے ساتھ کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے جاتے ہیں۔ اور سر ہلاتے جاتے ہیں۔ لیکن ایک طب کا طالب علم ہونے کے باوجود میری کھوپڑی جاہل آیاد کار کی طرح کند اور غبی تھی۔ اور ان کنکھیوں کا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لیکن جب اگست کی ایک صبح ہم سب سارہ بٹ کو لینے کے لئے قصبے گئے جو کونٹ اسکول سے بذریعہ ٹرین آ رہی تھی تو میں سب کچھ سمجھ گیا۔

چوک میں حسب معمول آباد کاروں کی گاڑیاں کھڑی تھیں اور ان میں طرح طرح کے سامان لدے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سال فصلوں کی خرابی کا کوئی اثر ان پر نہیں پڑا ہے۔ میرے چچا کے پرانے دوست ڈاکٹر ریڈ نے بالکل پیشہ ورانہ انداز میں مجھے وائٹ ایلی فینٹ سیلون میں ایک جام پینے کی دعوت

دی سیلوں میں اخروٹ کی لکڑی کی بنی ہوئی اونچی اور لمبی میز کے آگے چند آبادکار اگلے سال اچھی فصل ہونے کی امید میں شراب پی رہے تھے۔ چند گوالے اور چرواہے اپنے آپ کو ان سے الگ دکھانے کے لئے دوسرے کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور جب تک میں اُن سے مصافحہ کرتا رہا ڈاکٹر ریڈ بڑی بے چینی سے میرا انتظار کرتے رہے۔ ان کے چہرے پر متانت، اور اطوار میں شستگی تھی۔ لیکن ان کا لمبا سفید ہاتھ شراب کی کالی بوتل سے یوں لپٹا ہوا تھا اور ان کے ہاتھوں کی رگیں یوں ابھری ہوئی تھیں کہ میں ایک چھوٹے اور ناتجربہ کار ڈاکٹر کی حیثیت سے یہ سمجھا کہ یہ سب مئے گلگوں کا اثر ہے۔

شراب خانہ کا پردہ کھلے ہوئے دروازہ کے آگے سے ہٹا دیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گلی کے دوسرے پر ہولڈرنیس کے مکان کی سبز جھیل پر جمی اور براک ایک دوسرے کے سامنے یوں کھڑے ہیں جیسے پھر ان کے پرانے اختلافات رونما ہوگئے ہیں۔ ان کے گرد کھڑے ہوئے لوگ بڑی چالاکی سے انھیں لڑنے مرنے پر اُکسا رہے تھے۔ پس منظر میں سٹور کے پیلے تختے نظر آرہے تھے جن پر ٹین کے رنگین بورڈ لگے ہوئے تھے۔ جمیؔ تو چھریرے بدن کا تھا۔ اور بالکل اپنے باپ کی چھوٹی سی چلتی پھرتی تصویر معلوم ہوتا تھا اپنی مٹھیاں زور سے بھینچے کھڑا تھا۔ اور براک ایک قدم آگے بڑھائے قدرے یوں جھکا ہوا تھا جیسے ابھی اس کی ناک پر ایک زوردار مکّا رسید کردے گا۔ اس کا ہیٹ پیچھے کو جھک کر گدّی پر جا پڑا تھا۔ اور سہ پہر کی دھوپ میں اس کے ملائم بال چمک دار سوتے کے معلوم ہو رہے تھے۔

پھر وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ ایک گنجا اور گول سر کا آبادکار جس نے موٹے کھدر کا کرتہ پہن رکھا تھا آگے بڑھا، اس نے کہا: "میں چیمبرلین کے بیٹے کی طرف سے شرط لگاتا ہوں"

جونہی اس فقرے کا مفہوم میرے ذہن میں اترا۔ ایک لمحے کے لئے، صرف ایک لمحے کے لئے میں نے لوٹی بروٹن کو اپنی آنکھوں کے سامنے صاف صاف دیکھا، جیسے وہ سچ مچ آگئی ہو۔ ہمیشہ کی طرح خوبصورت اور حسین، اور جب وہ آبادکار دیاسلائی سے دانت کھسکاتے ہوئے مڑ گیا تو مجھے یوں لگا جیسے اس نے لوٹی کے منہ پہ تھوک دیا ہو۔ میں اس زبردست خاموشی سے آگاہ تھا جو گوالوں پہ چھا گئی تھی۔ اور اس عجیب و غریب وحشیانہ نفرت سے بھی واقف تھا۔ جو جنگل کی آگ کی طرح میرے اندر دوڑ گئی تھی۔ میں اپنے آپ کو اب تک طب کا ایک اچھا طالب علم سمجھتا رہا تھا جو جلدی ہی عملی دنیا میں داخل ہو کر انسانی زندگیوں کو دکھ اور موت سے بچائے۔ لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ مجھ پر سے مشرقی اسکولوں کی ظاہری تہذیب کا رنگ و روغن اتر چکا ہے اور میں ایک غیر سرسبز گھاس کے سمندر میں آباد بروٹن خاندان کا محض ایک جاہل نوجوان ہوں۔ جو اب شراب خانہ کے عقبی دروازہ سے باہر نکل رہا ہے۔ جہاں گاہکوں کی رائفلیں اور پستول اپنی اپنی جگہ پہ لٹکی ہوئی ہیں۔ میں جانتا تھا کہ گوالے اور چرواہے آہستہ آہستہ ہمارے علاقے کو چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ شراب خانے کا مالک بڑی عیاری سے سر جھکائے ڈاکٹر ریڈ سے بل وصول کر رہا ہے۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ میں ڈاکٹر ریڈ کو بھی قتل کردوں، جس نے حیرت انگیز قوت سے اچانک میری

رائفل کی نال کا رُخ پھیر دیا تھا اور گولی چھت میں لٹکے ہوئے پیتل کے لیمپ میں جا لگی تھی جس سے تیل ٹپک ٹپک کر فرش پر بہنے لگا تھا۔

گولی کی آواز سن کر لوگ چوک سے دوڑے ہوئے آئے اور دروازہ میں کھڑے ہوکر اندر جھانکنے لگے۔ باہر سے اچانک میرے چچا لوگوں کو مکھیاں سمجھ کر ایک طرف ہٹاتے ہوئے شراب خانہ میں داخل ہوئے۔ وہ ایک آزمودہ جنگی گھوڑے کی طرح مستقل مزاجی سے کھڑے ہوئے بارود کی بو سونگھ رہے تھے۔ ان کی سیاہ آنکھیں پورے کمرہ کا جائزہ لیتے لیتے مجھ پر آن جمیں۔ میں شراب خانہ کے ایک کونہ میں کھڑا ہوا تھا اور میرے ہاتھ میں چھ فائر کرنے والی رائفل تھی۔ جس کا وار اتفاق سے خالی گیا تھا۔

"کیا بات ہے ہال!" چچا نے پوچھا۔

اس وقت مجھ میں ان کی طرف دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ میں تو اپنے ہونٹ سختی سے بھینچے کھڑا تھا۔ وہ کافی دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نصف گھنٹہ گذر گیا ہے "کسی نے کیا کہا ہے والٹ؟" چچا نے ایک بھدے کٹے گوالے سے پوچھا۔ جس کی صدری کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اور چاندی کی گھڑی کی زنجیر جیب سے باہر لٹکی ہوئی نظر آرہی تھی۔

گوالے کی پیشانی پر پسینہ آگیا، اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس سر ہلا کر گویا یہ کہہ دیا کہ مجھے معلوم نہیں۔ چچا وہاں شدید غصّے کی حالت میں کچھ دیر اور کھڑے رہے۔ پرانے وقتوں کی طرح پورے کمرے میں اُن کی بارُعب شخصیت سب لوگوں پر چھائی ہوئی تھی۔ پھر انھوں نے کوئی نصف درجن لوگوں کی نظروں کا تعاقب

کرتے ہوئے اپنا سر دروازے کی طرف موڑ لیا۔ میں نے دیکھا کہ چچی اور براک پیچ و تاب کھاتے ہوئے بند دروازے کو کھول کر شراب خانہ میں داخل ہو گئے تھے۔ اور اب وہ اپنے سیاہ اور سنہری بالوں والے منصفانہ سروں کو دکھاتے ہوئے سب کے سامنے خاموش کھڑے تھے۔

مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ چچا پورے ایک منٹ تک سر گھمائے کس کی طرف دیکھتے رہے تھے۔ لیکن یہ مجھے معلوم ہے کہ میں براک کے پراشتیاق طفلانہ چہرے اور چمکتی ہوئی نیلی آنکھوں کو بڑے غور سے دیکھتا رہا تھا۔ اس ایک منٹ میں میرے ذہن میں وہ تمام باتیں عود کر آئیں جو میں نے اسے کرتے یا کہتے سنی تھیں۔ ابھی ابھی کمینہ اور غیر ذمہ دار اور اگلے ہی لمحے دلکش اور دل کو موہ لینے والا بالکل اپنی ماں لوئی ٹبر وٹو کی طرح ۔۔۔ اس کی دلکشی اور دل کو موہ لینے والی باتوں کو دیکھ کر اس کی کمینگی اور غیر ذمہ داری فراموش ہو جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اپنی ماں کی طرح آباد کاروں سے فوراً بے تکلف ہو جاتا تھا۔ اور یہ کہ میرے چچا کو اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنے میں کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑتی تھیں جب انھیں ایک چیز خریدنی ہوتی تھی تو وہ دو چیزیں خریدتے تھے۔ اور ہمیشہ دونوں کا حصہ برابر برابر تقسیم کرنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ حالانکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ براک واقعی بڑے حصے کا مستحق تھا۔ اس وقت یہ سوچ کر میں بہت حیران ہوتا تھا کہ شاید یہ ناقابل فہم بات ہی دونوں بھائیوں میں اس وقت سے فساد کی جڑ بنی ہوئی ہے جب سے انھوں نے چلنا شروع کیا ہے یا خدا جانے کوئی اور بات ہے؟

جب آخر کار میرے چچا مڑے تو میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر ناقابلِ بیان دُکھ چھایا ہُوا ہے۔

"اگر کسی اور کتّے کو کچھ کہنا ہے تو ابھی کہہ لے — ابھی وقت ہے"

انھوں نے سب لوگوں کو للکارتے ہوئے کہا۔ ان کی سیاہ آنکھوں سے وحشیانہ تشدّد کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

شراب خانہ کے اس طویل کمرے میں غضب کا سناٹا تھا۔ ہاں ایک تو تاش کھیلنے والی میز پر کاغذ کا پرزہ ہل رہا تھا۔ دوسرے باہر سے گھوڑے کی گھنٹیوں کی آواز آ رہی تھی۔ اور تیسرے شراب خانہ کی چھت میں لٹکے ہوئے پیتل کے لیمپ سے تیل گھنٹے کی ٹک ٹک کی طرح آہستہ آہستہ گر رہا تھا۔

پھر میرے چچا نے گویا مصنوعی دُکھ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ ہم خود بخود چلنے لگے۔ میرے آگے دونوں لڑکے تھے اور پیچھے چچا تھے۔ پھر ہم چوک میں آگئے۔

تیسرا حصہ

بیٹا

۱۴۔ جب کئی سال تک میں براک کو اپنے ذہن سے نہ نکال سکا۔ جب میں نے ایک تیز مزاج فرانسیسی سرجن کے مددگار کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ جو سینٹ میری ہسپتال اور بعد میں الیکزینڈر برادرز ہسپتال میں آپریشن کیا کرتا تھا تب بھی بچپا کے اس بیٹے کا خیال مجھے برابر ستاتا رہا اور آج بھی براک کے بارے میں ہر اس شکوک اور سوالات کے بغیر جو اس زمانہ میں میرے سامنے بھوت بن کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ کلوروفارم نہیں سونگھ سکتا۔ ہر لمحہ اس لڑکے کی بھولی بسری یادیں میرے دماغ میں بسی رہتی تھیں۔ اب براک پادری بننے کا کھیل کھیل رہا ہے۔ اور چرتے ہوئے مویشیوں کے گلے کو اپنا مخاطب سمجھ کر اونچی آواز سے خطبہ دے رہا ہے یا پنجم کے گیت گا رہا ہے۔ اور اب براک آبادکاروں کے بچوں کے ساتھ فوجی سردار بنا ہوا ہے۔ اور مجرم کو پھانسی پر لٹکانے کا حکم دے رہا ہے۔ یہ مجرم اصل میں ایک آوارہ کتا تھا جسے ایک آباد کار [illegible]

سے پکڑ لیا گیا تھا ۔ اور اب ننھا براک آباد کاروں کے بھوکے بچّوں کو موئ خانے لے جا رہا ہے جہاں وہ انھیں لبسکٹ اور سرکے میں پڑی ہوئی پیاز کھلائے گا ۔ اور اب ننھے براک کی انگلیاں بڑی شان سے لوئی بروٹن کے پیانو کے پُردوں پر پڑ رہی ہیں اور مشہور و معروف نغمے کمرے میں گونج رہے ہیں ۔ اور اب براک ٹماٹروں سے بھری ہوئی بوری کو پچاس پچاس فٹ تک لڑھکاتا لا رہا ہے ۔ اور اب براک خالی بندوق سے کھیل رہا ہے جو چچا اسے دیتے تھے اور کارتوس اپنے پاس رکھ لیتے تھے ۔

براک کو بے تحاشا باتیں کرنے کا بہت شوق تھا ۔ وہ گھوڑے کی سواری کو بھی بے حد پسند کرتا تھا ۔ جب وہ اپنے اور جمی کے مشترکہ اتالیق سے سبق لیتے وقت اسے طرح طرح سے دھوکے دیتا تھا اور وہاں سے بھاگنے کے لئے قسم قسم کے بہانے بناتا تھا ۔ تو وہ بیک وقت ایک جج کی طرح بدمزاج ، بروٹن خاندان کے ایک فرد کی طرح بے دھڑک اور اپنی مغرور ماں کی طرح دلکش اور شاندار ہوتا تھا ۔ اس کے ملائم سنہری بال ہر وقت میرے تصوّر میں بکھرے رہتے ۔

بوڑھا ڈاکٹر ریڈ ، جیسے وہ اب بہت جلد اپنے کئے کی سزا پانے والا ہو سالٹ فورک واپس جا کر بیمار پڑ گیا ۔ اور بڑے اطمینان سے اپنے آخری ایّام کو گزرتے ہوئے دیکھتا رہا ۔ ایکس چینج ہاؤس کے کمرے میں اس کی ہوئی مدتی طب کی کتابیں اس کا انتظار کرتی رہتی تھیں مگر وہ اپنے بستر مرگ پر پڑا کراہتا رہتا تھا ۔ اب اس کے پُرانے دوست بھی رات کو

گھنٹوں بیٹھے اس کے ساتھ خوش گپیاں نہیں کرتے تھے اور اب وہسکی کے جاموں کے ٹکرانے کی آوازیں بھی نہیں آتی تھیں۔ ادھر چچا نے مجھے تار دیا کہ گھر آجاؤ اور یہاں پریکٹس کرو۔

جب میں ٹرین سے اتر کر تنگ پگڈنڈیوں پر ہوتا ہوا ہوٹل پہنچا تو دیکھا کہ بوڑھا ڈاکٹر بے ہوشی کے عالم میں پڑا ہے۔ میں نے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اسے سکون پہنچانے کی بہت کوشش کی لیکن افسوس کہ میں اس کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔ حتیٰ کہ اس کی بوتل نے بھی سوکھ کر اس کا سکون چھین لیا تھا، پھر میرے چچا بھی اسے کوئی سکون نہ دے سکے۔ جو میرے یہاں آنے سے گھنٹوں پہلے سے خاموش بیٹھے سگریٹ پیتے رہتے تھے۔ جیسا کہ صحت کے زمانہ میں دونوں پرانے دوست ایک دوسرے کے پاس خاموش بیٹھے رہتے تھے بس کبھی کبھار کوئی بات کر لیتے تھے۔

"اب ڈاکٹر صاحب اس دنیا کی کوئی بات نہیں سوچتے۔ ان کا دل اچاٹ ہو چکا ہے۔" اس میکسیکو کی عورت نے مجھے بتایا۔ جو ان کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔

ایک دفعہ اچانک ہر اک کھیلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی سنہری بالوں والی لڑکی براؤن ہرن کی کھال کے جوتے پہنے آگئی ہے۔ اس نے آہستگی بھی نچلے سے بال کٹوا لیا۔ اب وہ بالکل جوان ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے وہ طلائی تمغہ بھی دکھایا جو اس نے باسکٹ بال کے کھیل میں جیتا تھا۔ اس نے بستر پر لیٹے ہوئے شخص کی طرف کوئی توجہ نہ دی جس کی مدد سے وہ اس دنیا میں

نازل ہُوا تھا۔ اور جب براکٹ وہاں کھڑا ہُوا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا، اور جب مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ماضی کی کوئی ٹھنڈی ہوا نئے سرے سے آ کر اس بیمار کمرے میں چلنے لگی ہے تو میں نے دیکھا تھا کہ بوڑھے ڈاکٹر کی آنکھوں میں زندگی کی رمق ہے اور وہ جینے کی شعوری کوشش کر رہا ہے۔ جیسے کسی گہرے اندھے کنوئیں میں اترا ہُوا کوئی شخص ہاتھ میں موم بتی لئے اوپر چرخی کے پاس کھڑے ہوئے شخص کو دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

اور جب براکٹ سیٹی بجاتا ہُوا ہال کمرے کی سیڑھیوں پر سے گزرتے ہوئے سرخ قالین پر اپنے قدموں کی چاپ کو ذرا ہلکا کرتے ہوئے نیچے اتر گیا تو ڈاکٹر نے آہستہ آہستہ بیٹھنے کی کوشش کی۔ کہنے لگا۔

"مسز بروٹن کب واپس آئیں گی؟"

اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھ میں اپنے چچا کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ ہو رہی تھی جنھوں نے سگریٹ کے کش لینے اچانک بند کر دیئے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب میں نے انھیں نہیں دیکھا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

اس کی آنکھ میں چمکتی ہوئی روشنی موم بتی کے دم توڑتے ہوئے شعلے کی طرح بجھ گئی۔ اس کے لمبے لمبے سفید ہاتھ جن کی رگوں میں سرخ شراب بھری ہوئی تھی۔ رضائی پر ادھموئی حالت میں جا پڑے۔ اور اس کے مرنے کے کافی دیر بعد وہی جذبہ جو میں لوئی بروٹن سے ملنے پر محسوس کیا کرتا تھا اس کا محض نام غیر متوقع طور پر سننے سے مجھ پر چھایا ہُوا تھا۔

ہم نے ڈاکٹر کو ہفتہ عشرہ کے بعد اس سنسان اور ویران میدان میں

دفن کر دیا جو اس ہرے بھرے، سرسبز و شاداب قبرستان سے بالکل مختلف تھا جو اس نے اپنے بچپن میں اپنے ورجینیا میں دیکھا تھا۔ لیکن وہ لوگ جو اس کے جنازہ میں شریک تھے اور اس کی قبر کے پاس ازراہِ احترام اپنی ٹوپیاں اتارے چپ چاپ کھڑے تھے، وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے۔ وہ تو کنکھیوں سے براک کو دیکھنے میں مصروف تھے۔ جس نے مجھ سے لمبا قد نکالا تھا۔ اس کے سنہری ملائم بالوں میں کہیں کہیں پیلاہٹ چھا گئی تھی۔ وہ برائس چیمبرلین سے بس چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ اپنے لمبے سیاہ کوٹ میں دوسروں سے الگ اور منفرد نظر آرہا تھا۔ ایک چُندا ہوا بڑا ہیٹ اس کے ہاتھ میں تھا، اور اس کے سنہری لمبے بالوں کی لٹیں کنپٹیوں کے پاس پڑی ہوئی تھیں۔

اس واقعے کے بعد اپنے چچا اور براک کی ہر بات، جو مجھے یاد ہے، بوڑھے ڈاکٹر کے دفتر کی آئیڈ و فارم اور کار بولک ایسڈ میں رچی ہوئی ہے۔ چند ہی دنوں کے بعد یہ دفتر میرا بن گیا تھا۔ سبز رنگ کا ایک لیمپ جو دواؤں کی شیشیوں اور بوتلوں پر اپنی پرچھائیاں ڈالتا رہتا تھا۔ پرانے چمڑے کے اس بکس پر رکھا رہتا تھا جس میں آلاتِ جراحی بند رہتے تھے۔ اور ایک ڈھانچہ کمرے کے ایک کونے میں ہمیشہ اپنی جگہ پر ساکن و جامد کھڑا رہتا تھا۔

سالٹ فورک میں آئے ہوئے مجھے ابھی ایک سال نہ ہوا تھا کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ براک سالٹ فورک میں جارجی انگرم کارٹر کی طرح مشہور و مقبول ہو چکا ہے۔ جس کی ایک قد آدم تصویر و ائٹ ایلی فینٹ سیلون کی سامنے والی

دیوار پر لٹکی ہوئی تھی۔ سنہری بالوں والا، شریف براک بروٹن رقص گاہ کی سیاہ بالوں والی عورتوں کا محبوب بنا ہوا تھا۔ اور وہی براک بروٹن قصبے کے بہترین فرنیچر پر بیٹھ کر تاش کا کھیل بڑی سنجیدگی سے کھیلا کرتا تھا۔ وہی براک بروٹن مائر اینیڈ روڈ کے شاندار پیانو کے سروں پہ اپنی نازک انگلیاں پھیر کر مشہور کلاسیکی نغمے چھیڑتا تھا۔ اور وہی براک بروٹن اپنی سرخ پہیوں والی بگھی میں اپنے پہلو میں ایک آبادکار کی خوبصورت لڑکی کو بٹھائے قصبے کے بازاروں میں گھومتا تھا اور وہی براک بروٹن آبادکاروں کے بچوں کے لئے مصری کی ڈلیاں خریدتا تھا۔ جو کننگ ہین مرکنٹائل کمپنی کے سٹور میں یتیموں کی طرح اس کے چاروں طرف کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور اسی براک بروٹن نے مسز آولسن کی تین سفید بطخوں کو گولی سے مار ڈالا تھا۔ اس وقت وہ گھوڑے پر چڑھا مسز اولسن کے مکان کے پاس سے گزر رہا تھا اور وہ اپنی بطخوں کو دانہ ڈال رہی تھی۔

مجھے اب تک اس کا وہ ڈھیلا ڈھالا بھورا سوٹ یاد ہے جسے دیکھ کر مجھے یونہی ایک خیال سا آیا تھا کہ پرائس چیمبرلین بھی ایک زمانہ میں ایسا ہی سوٹ پہنا کرتا تھا۔ یہ سوٹ پہن کر وہ اپنی ماں کی سہیلی مائر اینیڈ روڈ کو ساتھ لے کر، پُرخلوص پارسائی سے، عشائے ربانی کی رسم میں شریک ہونے کے لئے گرجا جاتا تھا۔ اور مجھے یاد ہے کہ وہی سوٹ پہن کر جب کہ اس کا ہیٹ بے نیازی سے گدی پہ پڑا ہوا ہوتا تھا اور اس کے سنہری ملائم بالوں کے لچھے صاف نظر آ رہے ہوتے تھے وہ وائٹ ایل فینیٹ سیلون یا ڈچ چارلی کے ہوٹل سے سو دو سو ڈالروں کی مالیت کے جیتے ہوئے آلو

خریدتا تھا اور آباد کاروں کے بچوں کو جا کھلاتا تھا۔

وہ بھنے ہوئے آلوؤں کی قیمت عام آدمیوں کی طرح ادا نہیں کرتا تھا۔ وہ بروٹن خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے اگر وہ ہزار ڈالر نقدی کی صورت میں بھی مانگ لیتا تو شراب خانہ کا مالک انکار نہ کرتا اور بلا چون و چرا نکال کر دے دیتا۔ اور حسب معمول اپنے کھاتہ میں لکھ لیتا۔ اور جب کرنل صاحب قصبے میں آتے تو اپنے بیٹے کا ادھار پوچھتے، اور وہ وہیں شراب خانہ کی گیلی میز پہ بیٹھ کر کنگ مرکنٹائل کمپنی کے نام ایک چیک کاٹ دیتے۔

براک اور اس کے پیچیدہ طور طریق، اور اس سے چچا کی محبت اور شفقت میرے لئے ایک نہایت الجھا ہوا معمّا بنا رہا ہے۔ جسے میں ہمیشہ حل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ غالباً اسی لئے اب میں دوسروں کی طرح لوئی بروٹن کو دیکھنے اور اس سے ملنے کی خواہش نہ رکھتا تھا۔ میرے نزدیک وہ اب بھی اس جوان لڑکے کی خوبصورت ماں تھی۔ اور اس سال موسم گرما کے آغاز میں جب دوبارہ پھلواریوں میں غنچے چٹکنے لگے۔ کتاب تقدیر نے مجھے اپنے کچھ اور صفحے دکھائے۔

مجھے لوگ اس خندق کے پاس لے گئے تھے جہاں آباد کاروں کی ایک عورت نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ وہ ٹھنگنے قد کی عورت تھی اور اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ میں اُسے اس حالت میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ ڈاکٹر یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر رہتا تھا۔ کئی دنوں کے بعد جب لوگ یہ قصہ بھول بھال گئے تو میں نے محسوس کیا کہ میں

ایک ڈاکٹر تو قطعاً نہیں ہوں کیونکہ میں اس بیمار عورت کو چھوڑ آیا تھا۔ میں تو محض ایک تھکا ہوا شکست خوردہ گوالا ہوں۔ اور میں اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا کہ میں اپنے چچا کے مکان میں انہی پرانی چیزوں کے درمیان کم از کم ایک رات اور گزاروں۔

جب میں مویشی خانے واپس آیا تو مجھے خوشی ہوئی تھی۔ جس وقت میں وہاں پہنچا تو شام کا اندھیرا چھا چکا تھا، مجھے دور سے مویشی خانہ کی درجنوں کھڑکیوں سے روشنی باہر آتی ہوئی نظر آ رہی تھی، جیسا کہ میں ماضی میں اکثر دیکھتا رہا تھا۔ اور جب میں پرانے ہال کمرے میں داخل ہوا تو مجھے یہ عجیب احساس ہوا کہ کوئی عورت وہاں بیٹھی ہوئی ہے۔ ایک لمحے کے لئے تو یہ ناقابل یقین خیال بھی ابھرا کہ لوئی بروٹن واپس آگئی ہے۔ پھر سارہ بٹ لڑکوں کے سے کسے ہوئے سفید کپڑے پہنے جس کی آستینوں کے کف سُرخ رنگ کے تھے کھانے کے کمرے سے اچانک نمودار ہوئی اور میرا استقبال کرنے کے لئے آگے بڑھی۔ کہنے لگی کہ اس نے اسکول کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا ہے۔ اور آج ہی صبح وہ یہاں اس وقت پہنچی تھی جب میں تھوڑی دیر پہلے لوگوں کے ساتھ اس خندق پر چلا گیا تھا۔ جو یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر واقع تھی۔

انھوں نے کھانے کی میز پر میرے لئے ایک جگہ خالی کر دی۔ میز پر سفید موم بتیاں جل رہی تھیں اور ان کی پرچھائیاں میز پر رقص کر رہی تھیں پرانی بڑی میز کے بیچ میں گلاب کے پھولوں کا ایک بڑا گلدستہ رکھا ہوا تھا

اور میرے چاروں طرف شجر پردے لٹکے ہوئے تھے اور کمرے میں پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ میں ان چیزوں سے بہت متاثر ہوا۔ خاص طور پر اس لئے کہ میں اپنی اس سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ جب سے لوٹی بروٹن یہاں سے گئی ہے کھانے کی میز پہ یہ اہتمام کبھی نہ ہوا تھا۔ کھانے کے دوران میں میں نے دیکھا کہ چچا اپنی کرسی پر بالکل چپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُن کے جھریوں والے چہرے پر ہلکی ہلکی میدانی حرارت کی وہی شگفتہ چمک دمک ہے۔ جیسے میں نے کوئی ایک سال سے نہ دیکھا تھا۔ اور ان کی سیاہ آنکھیں برابر سارہ بٹ کو تک رہی ہیں۔ اور ان میں غصے کی چنگاریوں کے بجائے محبت کے کنول کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوب کر میں یہ تاثر لے رہا تھا کہ وہ کوئی اور سیاہ بالوں والی اور گداز عریاں بازوؤں والی شخصیت ہے جسے وہ اس میز پہ دوسرے جوان اور ہشاش بشاش مہمانوں کے درمیان چہکتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔

اب ہم نشست گاہ میں آ گئے تھے۔ سارہ بٹ پرانے پیانو کے سُروں سے اپنے کونونٹ اسکول سے سیکھے ہوئے کچھ نغمے نکال رہی تھی اور چچا کہہ رہے تھے کہ براک بھی اس وقت قصبے سے واپس آ گیا ہوتا تو اپنی بہن کی موسیقی سے لطف اندوز ہوتا۔ کسی نے جمی کو آواز دی اور وہ باہر چلا گیا۔ اب کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی اور سارہ بٹ ایک ایسا نغمہ الاپ رہی تھی جس کا نام تو میں نہیں جانتا لیکن جو اس کی ماں کی نرم و نازک انگلیوں نے انہی کالے پیلے سُروں سے اس روز الاپا تھا جب

کمرے میں فورٹ ایلنگ سے لے کر سانٹا فی تک سے آئے ہوئے مہمان جمع تھے میں نے دیکھا کہ چچا کے ہاتھ میں سگار تھا اور وہ بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ کمرے میں گونجتے ہوئے اس پرانے راگ کی موجودگی میں ایک دو منٹ کے لئے تو یوں لگا جیسے اس علاقہ میں آبادکار قطعاً نہیں آئے ہیں اور جیسے ابھی بلیک ہیٹی تینوں بچوں کو ہمراہ لئے دروازہ میں آئے گی اور اُن کی ماں کو شب بخیر کہہ کر واپس چلی جائے گی۔

میرا یہ احساس اتنا قوی تھا کہ میں نے نظریں اٹھا کر دروازہ کی طرف دیکھا وہاں جمی کھڑا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے یوں لگا کہ وہ بڑے غور سے موسیقی سن رہا ہے۔ پھر میں اس کے جوان چہرے پر اُبھری ہوئی رگوں کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے لعنت برس رہی تھی۔ اور سارہ بنٹ کے راگ ختم کرنے سے ذرا پہلے وہ اس گھوڑے کے بالوں سے بھری ہوئی گدی دار آرام کرسی کی طرف بڑھنے لگا جہاں اس کا باپ متکبرانہ انداز میں خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

پھر اس نے اپنی نیچی آواز میں کہا: "میں نے ابھی ابھی سُنا ہے کہ یراک نے قصبے میں ڈچ چارلی کو گولی سے ہلاک کر دیا ہے۔"

سارہ بنٹ اپنے بھائی کی یہ بات سُنے بغیر برابر پیانو کے سُروں سے راگ نکالتی رہی معلوم ہوتا تھا کہ چچا ابھی تک لوئی بروٹن کے پُرانے راگ کے تصورات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

وہ جمی کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے اس نے آ کر یہ

خبر سنائی ہے کہ کچھ گائیں لال جھیل کی دلدل میں پھنس گئی ہیں ؟ اور جیسے اُن کا لٹکا ہوا لرزتا ہوا نچلا ہونٹ اس بات پر غور کر رہا تھا کہ ایسے بے وقت انھیں دلدل سے نکالنے کے لیے کارندوں کو بھیجا جائے یا نہیں ۔

"براک نے کسے ہلاک کر دیا ؟" انھوں نے اپنا بڑا ہاتھ اس طاقتور سانڈ کی طرح نیچے گراتے ہوئے پوچھا۔ جو اپنے جسم پر لگے ہوئے پہلے گہرے زخم کی تکلیف سے بلبلا رہا ہو۔

سارہ بٹ نے یہ اندازہ کر کے کہ دال میں کچھ کالا ہے، پیانو بند کر دیا۔ ہمیں دور پگڈنڈی پر کسی گھوڑے کے دوڑنے کی آواز آرہی تھی۔ پھر چچی نے اپنی نیچی آواز میں جواب دیا جو اس کمرے میں بیٹھے ہوئے تین اشخاص نے پوری طرح سن لیا "ڈرچ چارلی کو، وہ کہتا تھا کہ سیاہ بالوں والی عورت جو اس کی طرف سے تاش کھیلتی ہے ۔براک سے ملی ہوئی ہے اور ناجائز طور پر اس کی حمایت کرتی ہے، وہ کہتا تھا کہ براک جب بھی جوئے کی میز پر آتا ہے سب کو جیت لیتا ہے۔ آخر اس کا کیا راز ہے ؟ پھر دونوں میں گالم گلوچ ہونے لگی ۔ چارلی اپنی بندوق پر جھپٹا لیکن براک نے بندوق اٹھانے سے پہلے ہی اس پر وار کر دیا۔"

یہ سن کر سارہ بٹ نے ایک ہلکی سی چیخ ماری، لیکن اب تک میرے چچا سنبھل چکے تھے۔ اور اپنے آہنی عزم و ارادہ کے ساتھ کرسی پر ہوشیار ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ مگر ان کے چہرے پر گہری جھریاں اب بھی نظر آرہی تھیں۔

"چارلی مرگیا ہے کیا؟" انھوں نے پوچھا۔

"یہ تو معلوم نہیں، انھوں نے براک کو حوالات میں بند کر دیا ہے"۔ جمی نے جواب دیا۔

میرا خیال تھا کہ اس خبر سے چچا کے ذہن پر ایک جھٹکا لگا ہوگا لیکن وہ اسی طرح ایک جابر و ظالم تاتار کی طرح چپ بیٹھے رہے۔ ان کے چہرے پر وہی زبردست تکبر چھایا ہوا تھا اور جب جمی نے وہ تمام باتیں آہستہ آہستہ سنائیں جو اسے کارندوں نے بتائی تھیں۔ چچا کے تکبر میں کسی طرح کی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ صرف اس وقت چچا نے اپنے جذبہ کا اظہار کیا جب جمی نے باتوں باتوں میں برائس چیمبرلین کا نام لیا۔ اُن کا سر پہلے کی طرح جوش میں آکر بلند ہوگیا اور ان کے سفید بال کھڑے ہوگئے۔

"چیمبرلین کا اس بات سے کیا تعلق ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

پہلے تو جمی نے اس سوال کا جواب دینے سے گریز کیا لیکن وہ اپنے باپ کی دہکتی آنکھوں کی تاب نہ لاکر فرش کو گھورر ہا تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا "جج چیمبرلین ہی نے براک کو حوالات سے نکلوایا ہے۔ جج کہتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ براک ابھی بچہ ہے اور دوسرے یہ کہ وہ معاملات کی خود چھان بین کرنا چاہتا ہے۔ اگر براک نے اپنے آپ کو درست کر لیا تو وہ کہتا ہے کہ وہ اس پر مقدمہ نہیں چلنے دے گا۔ براک کو اپنے چال چلن کے بارے میں اکثر جج چیمبرلین کو رپورٹ پیش کرنی پڑے گی"۔

ایک لمحے کے لئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے برائس چیمبرلین کا سفید لمبا ناخن، کسی بہت بڑے دیو کے ہاتھ کی طرح، پورے سالٹ فورک پر سے ہوتا ہوا آباد کاروں اور اصطبلوں کے لفنگوں کے سامنے اور قصبہ کی عورتوں، گوالوں کی بیویوں اور رقص گاہ کی ناچنے والی عورتوں کے سامنے ہشاش بشاش خوش مزاج، نازک اندام لوئی برونٹ کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگانے کے لئے بڑھتا ہی چلا آ رہا ہے۔

میں نے اس سے پہلے سینکڑوں مرتبہ اپنے چچا کو غصّے کی حالت میں دیکھا تھا۔ لیکن خون کو اُن کی رگوں میں اتنی تندی سے کبھی دوڑتے نہ دیکھا تھا۔ اُن کا چہرہ اس وقت ایک ایسے کالے طوفان کی طرح غضبناک ہوگیا تھا جس سے برابر بجلیاں نکل رہی تھیں یہاں تک کہ کمرے کے باہر بھی میں اس آگ کی اٹھتی ہوئی چنگاریوں کو سچ مچ محسوس کر رہا تھا۔ جو ایک بار ان میں پیدا ہو جاتی تھی تو جنگل کی آگ کی طرح مسلسل جلتی رہتی تھی۔ اور کوئی آدمی نہ اُسے بجھا سکتا تھا نہ اس کی آنچ کے سامنے کھڑا ہو سکتا تھا۔

پھر میں نے دیکھا کہ وہ کرسی پر سے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور دروازے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ بھول ہی چکے ہیں کہ ہم بھی کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم سب جان رہے تھے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ پھر ہم نے دیکھا کہ وہ دیوار کے پاس کھڑے ہوئے صنوبر کی کھونٹی پر سے اپنی پرانی بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی اُتار رہے

ہیں۔ سارہ بٹ فوراً اپنے اسٹول پر سے اٹھی اور جلدی جلدی چل کر کمرے کے دوسرے کونے میں جا پہنچی۔ جہاں پیتل اور سنگ مرمر کے بلیے اسٹینڈ پر چینی کا رنگین لیمپ جل رہا تھا۔

سارہ بٹ التجائیں کرنے لگی: "پاپا آج رات نہ جایئے کل صبح ہال اور چچی چلے جائیں گے۔"

وہ اس طرح خاموش کھڑے تھے جیسے ان میں سننے کی طاقت ہی نہ ہو۔ وہ چند منٹ تک بیٹی کے یکسوئے کتے رہے۔ پھر انھوں نے ہم تینوں کو ایسی خشمگیں نگاہوں سے دیکھا جو ہم سے کہہ رہی تھیں کہ اگر ہم وہاں جائیں گے بھی تو ایک حد سے آگے نہ بڑھیں گے۔ اور یہ کہ وہ ابھی تک اپنے پورے خاندان کے جس میں ہر اک بھی شامل ہے سربراہ ہیں۔

لیکن وہ نہیں گئے۔ اس وسیع ہال کمرے میں چند منٹ اس طرح چپ چاپ کھڑے رہے جیسے ہماری بات پر غور کر رہے ہوں۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے گیلری کے زینے پر مانوس قدموں کی چاپ سُنی۔ ہر اک اپنے سنہری گھنگریالے بالوں کو لہراتا ہوا سیٹی بجاتا، چچا کے برابر سے گزرتا ہال کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اسی طرح ہشاش بشاش، تازہ دم اور صحیح وسلامت تھا جیسا ہیں نے ہمیشہ دیکھا تھا۔

اس نے یقیناً ہمارے چہروں سے یہ اندازہ کر لیا ہوگا کہ ہم اس کی ہر حرکت سے آگاہ ہیں۔ اسی لئے تو جب وہ سارہ بٹ سے مذاق کرنے لگا تھا تو وہ اور زیادہ خوبصورت، اور زیادہ مسرور معلوم ہونے لگا تھا۔ حالانکہ

سارہ اپنے پیلے رخساروں کے ساتھ اس سے چمٹ کر رونے کے لئے بالکل تیار کھڑی تھی۔ اب وہ سارہ پر اس بات پر خفا ہو رہا تھا کہ جب وہ قصبے سے گزر رہی تھی تو اس نے اسے ہوٹل سے کیوں نہیں جگا لیا تھا۔ جہاں وہ سارا دن سویا رہتا ہے۔ وہ ہنس رہا تھا۔ باتیں کر رہا تھا اس کا منہ چڑا رہا تھا مصنف ٹامس ملاڈے کے عشقیہ خطوط کا ذکر چھیڑ کر اسے تنگ کر رہا تھا جو عورتیں خوب مزے لے لے کر پڑھتی ہیں۔ اور میٹھی میٹھی باتیں کر کے اسے بے صبری سے منا رہا تھا کہ آؤ پیانو پر دوگانا گائیں۔ اور جب وہ دونوں پیانو کے پاس پہنچ گئے تو پیرا نے ایک کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گیا۔ اور اپنا ایک ہاتھ سارہ کی کمر کے گرد حمائل کر لیا۔ اور پھر سارہ نے پیانو کے دھیمے سروں سے ایک شاندار راگ چھیڑ دیا۔

اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ لوٹی بروٹن کے سوا اس علاقے کے، بلکہ دنیا کے کسی شخص میں اتنی ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ ایسے وقت ایسے شاندار انداز میں یہاں آتا اور ہمیں اور چچا کو اس طرح نہتا کر دیتا کہ وہ بیچارے دوبارہ اپنی گھوڑے کے بالوں سے بھری ہوئی گدی دار آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ جب تک دوگانا ہوتا رہا وہ وہیں چپ چاپ بیٹھے گانے کے ختم ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ ان کے مرکش چہرے میں گڑی ہوئی گہری آنکھیں بڑے دکھ کے ساتھ، لیکن ناقابل بیان محبت کے ساتھ پراک پہ جمی ہوئی تھیں۔

آخر کار سارہ بستر سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور

چچا وہیں بیٹھے براک کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ انھوں نے کہنا شروع کیا: "براک میں ابھی تم سے باتیں کرنے کے لیے قصبے جانے والا تھا۔ کیا یہ سچ ہے کہ تم نے ڈچ چارلی کو ہلاک کر دیا ہے ؟"

براک کا چہرہ دیکھتے دیکھتے نامحسوس طور پر تبدیل ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوا آنکھوں کو قدرے میچ کر میرے چچا کی طرف دیکھتا رہا۔

"میں اسے گولی مارنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میں اگر نہ مارتا تو وہ مجھے مار دیتا۔"

بوڑھے آدمی نے بڑے اطمینان سے مزید پوچھا: "کیا یہ سچ ہے کہ وہ عورت جو ڈچ چارلی کی طرف سے جوا کھیلتی ہے وہ تمھاری طرف داری کرتی تھی۔ اور تم اس بات سے آگاہ تھے ؟"

براک نے جواب دیا: "تمام عورتیں میری طرف داری کرتی ہیں کیونکہ وہ مجھے پسند کرتی ہیں۔ اور مجھے دل سے چاہتی ہیں۔" یہ کہتے کہتے اس کے ہونٹ دفعتہً بھنچ گئے۔ لیکن اس کی سرد مہر، بے حجاب، حقارت آمیز آنکھیں میرے چچا پر جمی ہوئی رہ گئیں۔

چچا کے سنگلاخ چہرے پر ایک رنگ آتا ایک جاتا۔ انھوں نے بڑی مشکل سے کہا: "میں مرنے مارنے کی ذرہ بھی پروا نہیں کرتا۔ مرد لڑا ہی کرتے ہیں۔ مرتے بھی ہیں اور مارتے بھی ہیں۔ اور اگر تم مر جاتے تو میں اس وقت بھی کوئی خاص افسوس نہ کرتا۔ میں نے تم سے یہ بھی کہہ رکھا ہے کہ جب تک تم ایمان داری سے کھیلتے رہو گے تمھارا راستہ جوئے کے فرش میں

اپنی جیب سے ادا کر دوں گا۔ میں تم سے ہمیشہ یہ کہتا رہا ہوں کہ دھوکا دینا حیوانی زندگی کی سب سے ذلیل اور نچلی شکل ہے۔ اور اب چونکہ تم نے دھوکا دیا ہے۔ خواہ کوئی کچھ بھی بکتا رہے۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ تم خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر قانونی کارروائیوں سے گزرو اور سب کے سامنے اپنے دامن کا یہ داغ صاف کر دو یا سزا بھگتو۔"

براکٹ ان کی طرف گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اچانک ایک عجیب و غریب حقارت چمکنے لگی تھی۔

اس نے بڑی سرکش گستاخی سے کہا "دنیا کا کوئی باپ اپنے بیٹے کو قید خانے نہیں بھیجے گا۔ جبکہ جج نے اسے رہا کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں مجھے ایک ملازمت بھی مل گئی ہے اور آج رات میں اسی سلسلے میں رخصت لینے آیا ہوں۔ میں جارج ہولڈرنیس اینڈ کمپنی کے کاؤنٹر پر بیٹھا کروں گا۔"

برائس چیمبرلین کے چچا کا نام سن کر اور اصل بات کی تہہ تک پہنچ کر، میرے چچا اٹھ بیٹھے اور ان کے گلے اور ہاتھوں کی رگیں اس طرح پھول گئیں کہ خود براکٹ بھی ڈر گیا۔ اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن براکٹ کی آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں چمک رہی تھیں اور اس کا سفید چہرہ بھی بہت جوش میں تھا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ میرے چچا وہیں کے وہیں بیٹھے رہ گئے ہیں اور اس کی طرف نہیں جھپٹے ہیں تو کمرے میں بڑی بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

اس نے چلاتے ہوئے کہا "آپ مجھے اس ویران مویشی خانہ میں مقید

نہیں رکھ سکتے۔ میں اٹھارہ برس کا ہوگیا ہوں۔ مجھے مویشی چرانے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا۔ میں وہاں رہنا چاہتا ہوں جہاں زندگی ہے، ہنگامہ ہے، جہاں انسان بستے ہیں، جہاں دکانیں ہیں، روشنیاں ہیں، موسیقی ہے، رقص ہے اور دنیا بھر کی چیزیں ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں اس سنسان جگہ پر مزید ٹھہروں خدا کرے مجھے موت آجائے۔ میں یہاں رہنے کے بجائے قبر میں رہنا پسند کروں گا۔"

میں نے ان کی مزید کوئی بات نہ سنی۔ اس پورے منظر میں، ان تمام الفاظ میں کوئی ایسی خطرناک بات تھی جو پہلے بھی واقع ہو چکی تھی۔ میں اس منظر کو اور ان الفاظ کو پہلے بھی سن چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چچا اور چچی اپنے اپنے کمرے میں جا چکے ہیں۔ اور میں اسی نرم گدی دار صوفے پر بیٹھا ہوا لڈی بروٹن کو اسی برساتی کے قالین پر ٹہلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں بھی بالکل ایسی ہی چنگاریاں چمک رہی ہیں اور اس کے ہونٹوں سے بھی بالکل ایسے ہی الفاظ نکل رہے ہیں۔

میں نے اپنے چچا کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا اور وہ اس طرح زور زور سے سانس لے رہے تھے اور ہانپ رہے تھے جیسے انھوں نے کوئی خوفناک بھوت دیکھ لیا ہے۔

"بہت اچھا براک"۔ انھوں نے بڑی مشکل سے کہا۔ یہ کچھ میں ہی جانتا ہوں کہ انھیں یہ فقرے زبان سے ادا کرنے کے لئے کتنی بڑی ہمت ادا کرنی پڑی ہوگی۔" چند سال پہلے میں ایک اور وجود کی راہ میں حائل ہوا تھا، تو

آج تک پچھتا رہا ہوں - میں تمہاری راہ میں حائل نہیں ہوں گا "

اپنے بھائی جمی کے خاموش چہرے پر ایک فتح مندانہ نگاہ ڈالتے ہوئے براک جلدی سے کمرے سے نکل گیا - اس کے جانے کے بعد کافی دیر تک چچا اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے کھڑکی سے باہر تکتے رہے - کھڑکی کے باہر گھپ اندھیرا تھا اور وہ وہاں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے - اس سے پہلے مجھے کبھی یہ احساس نہ ہوا تھا کہ ان کے چہرے پر بے اندازہ جھرّیاں پڑی ہوئی ہیں - وہ چہرہ آخر کار ایک بوڑھے آدمی کا چہرہ بن گیا تھا اور کسی غیر مزروعہ بنجر کھیت کی طرح ویران معلوم ہوتا تھا - اور اُن کا باقی حصہ اس شخص کا ڈھانچہ معلوم ہوتا تھا جو کبھی بہت مضبوط اور طاقتور تھا جس کی کسی باطنی خشک سالی نے زندگی اور قوت کی باقیماندہ نالیوں کو بالکل ہی خشک کر دیا تھا -

صرف ان کی آنکھیں وہی تھیں ان میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا تھا - ان ان گڑھوں میں اسی طرح آگ دہک رہی تھی، ان میں ابھی تک ایک ناقابلِ بیان تلخی موجود تھی - تھوڑی دیر کے بعد وہ بڑی مشکل سے اٹھے - انھوں نے جمی اور میری طرف کوئی توجہ نہ دی جو وہیں بڑی بیچارگی سے کھڑے ہوئے تھے - جمی نے کھڑا ہونے اور چلنے میں ان کی مدد کرنی چاہی تو انھوں نے اسے بری طرح جھٹک دیا - اور وہ بیٹے کے آگے آگے اپنے جوتوں کو آہستہ آہستہ مگر بڑی سنگ دلی سے چباتے ہوئے زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر چپ چاپ اپنے اُجڑے ہوئے ویران ہوتے کے کمرے میں چلے گئے -

۱۴۔ سالٹ نورک کی خم دار گلیوں میں سے ایک کے نکڑ پر ایک بہت بڑا درخت کھڑا رہتا تھا۔ اس کی چھال اتنی کھردری اور سخت تھی کہ میں نے کسی درخت کی نہ دیکھی تھی۔ اور اس کی ٹہنیاں بل دار تھیں۔ اس درخت نے تمام قبیلوں کی چڑھائیاں اور آبادکاروں کے لمبے لمبے قافلوں کے حملے دیکھ رکھے تھے۔ یہ درخت اب بھی اپنی جگہ کھڑا ہوا تھا اور ہمیشہ کی طرح سرسبز و شاداب تھا۔ اس کے نیچے ایک چھوٹا سا مکان تھا تھکے ہارے مسافر اس درخت کے سایہ میں ستاتے تھے اور لوگ اپنی کرسیوں پر اس کی گھنی چھاؤں تلے گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے۔

کچھ عرصے سے آبادکاروں کا رُخ اس درخت کی طرف بھی ہو گیا تھا اور ان کے گھوڑوں نے اس کے کوئی آدھے پتّوں کو صاف کر دیا تھا ایک دفعہ اس پر بجلی بھی گر پڑی تھی اور اس چھوٹے مکان کی مالکہ اور اس کے نوجوان بیٹے نے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی تھی۔ اور ایک صبح جب میں اپنے دفتر جاتا ہوا اس درخت کے پاس سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ میں بڑے غور سے اس کی طرف تک رہا تھا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ گذشتہ رات کی سخت آندھی کو اس بوڑھے درخت نے برداشت کر لیا ہے۔

اور اب جب میں اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ میں

یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا کہ گذشتہ رات کی سخت آندھی کے باوجود وہ درخت علاقے کی زمین میں اپنی جڑیں گاڑے اور اپنی چوٹی آسمان کی طرف بلند کئے کھڑا تھا۔ بلکہ میں اصل میں اس بوڑھے شخص کو دیکھ رہا تھا جس نے اس بوڑھے درخت کی طرح تمام قدیم قبیلوں کی چڑھائیاں اور آبادکاروں کے لمبے لمبے قافلوں کے حملے دیکھے تھے۔

جس روز خزاں کی آمد کے ساتھ عدالت کھلنے والی تھی، اس سے ایک روز پہلے شام کے وقت ڈرچ چارلی گولی کے لگے ہوئے زخموں کی تاب نہ لاکر سیلون کے اوپر والے کمرے میں کراہتا ہوا ہمیشہ کے لئے چل بسا۔ اور اسی روز رات کے اندھیرے میں براک بھی کہیں چلا گیا۔ اور اپنے پیچھے سالٹ فورک کی دھیمی دھیمی روشنیاں اور ہولڈرنیس اینڈ کمپنی کی تجوری بالکل خالی چھوڑ گیا۔ میں نے اپنے چچا کو اسی شام سے نہ دیکھا تھا جب گولی چلنے کا واقعہ پیش آیا تھا۔ جب مجھے ان کے قصبے میں آنے کا خیال آتا تھا، تو مجھے افسوس ہوتا تھا کیونکہ یہاں کا بچہ بچہ خود اپنی آنکھوں سے ان کے چہرے کی جھریوں کو دیکھ لے گا کہ وہ کتنے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اور اب تو مجھے یہ یقین ہو چکا تھا کہ وہ سالٹ فورک کبھی نہیں آئیں گے اور اگر کبھی آئے بھی تو عرصہ دراز کے بعد!

لیکن ایک یا دو روز کے بعد ہی میں نے دیکھا کہ وہ پلازا کے پاس سے آہستہ آہستہ گزر رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی جگہ ان کی پرانی طاقتور شخصیت کا سایہ چل رہا ہے۔ اس کے باوجود ان کی چال میں وہی

مستقل مزاجی، وہی تکبّر، وہی سنگ دلی اب بھی موجود تھی۔ جسے میں ہمیشہ سے دیکھتا آیا تھا۔ اور جب لوگوں نے انھیں اپنے قریب آتا ہوا دیکھا تو وہ خاصے سنجیدہ ہوگئے اور انھوں نے بڑے احترام سے ان کا استقبال کیا "آیئے کرنل صاحب!" — "اوہو کرنل صاحب آپ تو بالکل سوکھ گئے!" — اور جب کرنل صاحب ان کے پاس سے گزر گئے تو وہ لوگ کچھ سوچتے ہوئے نظروں سے ان کا تعاقب کرتے رہ گئے۔

اور جب ہمیں یہ خبریں ملیں کہ براک کو لوگوں نے ایلپاسو میں دیکھا ہے اور اب وہ براک چیمبرلین کے نام سے پکارا جاتا ہے تو ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ اب سارا قصّہ ختم ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ جمّی کا بھی یہی خیال تھا۔ جس کا اعتراف اس نے مجھ سے تو نہیں مگر اور لوگوں سے کیا۔ اور میں نے کبھی جمّی کو براک کا نام اپنی زبان پر لاتے نہیں سنا۔ مگر وہ قصّہ ختم نہیں ہوا تھا۔ ایک دفعہ سارہ ہنٹ کی شادی کے موقع پر وہ گہرے گڑھوں میں دھنسی ہوئی، جلتی ہوئی آنکھیں ہر مہمان کا جائزہ لے رہی تھیں۔ جیسے اس مویشی خانے کی سجی ہوئی نشست گاہ سے کوئی محبوب شخصیت غائب ہو۔ یہ میں آج تک یقین کی حد تک نہیں سمجھ سکا کہ وہ غائب شدہ شخصیت لوئی برونٹن تھی یا براک برونٹن!"

لیکن اب یہ بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے چچا براک کے متعلق ایلیو کرک اور ڈن ورکے اخبارات کا کونہ کونہ چھان مارتے تھے۔ ... اس بات کو بھی وہ اپنے دل کے دکھ کی طرح ایک راز بنائے ہوئے تھے۔

اُن کے ماتھے کی کسی شکن سے، ان کی آنکھوں کی کسی جنبش سے، ان کے چہرے کی کسی حرکت سے ان کی دلی کیفیت کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ اور جو کچھ ان کے دل پر گزر رہی تھی اُسے وہ کبھی اپنے ہونٹوں پر نہ لائے۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ جانتا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے متعلق عجیب عجیب خبریں سننے میں آ رہی تھیں، کچھ اس قسم کی خبریں:۔ براک نے کرپل کریک کے قمار خانہ سے آٹھ ہزار ڈالر بے ایمانی سے جیت لئے۔ براک نے میکسیکو کے ایک چرواہے کا گلا گھونٹ کر تین نقرئی سکّے چھین لئے۔ آج صبح براک وائٹ اوکس میں ڈپٹی کی حیثیت سے پھر رہا تھا اور اسی شام اس نے ایک گاڑی بان کا گلا گھونٹ کر اس کی گاڑی چھین لی۔ اور اس پر بیٹھ کر قصبہ میں خوب گولیاں چلائیں۔ اب براک ضلعی افسر کو لوٹنے کے لئے اولڈ میکسیکو کے جنوب میں جا رہا ہے۔ اور اب وہ اپنے گھوڑے پر چڑھا جنگلوں میں چھپتا پھر رہا ہے۔ اور اب براک اپنی محبوبہ کے لئے جو ایک آبادکار کی بیٹی تھی اور ہمارے ساتھ والے ضلع میں رہتی تھی، مشرق کی سمت گھوڑا دوڑائے جا رہا ہے جہاں سے وہ کوئی بیش قیمت ہار چرا کر لائے گا۔ غرض براک میرے لئے کچھ اور ہی بن چکا تھا۔

وہ میرے لئے محض ایک شوخ خیال کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک ایسا شخص جس سے نہ میں کبھی ملا تھا نہ اُسے کہیں دیکھا تھا۔ بس ایک نام تھا جس کی خطرناک کارروائیاں ہوناہو سے لے کر اریگان تک کے تمام اخبارات میں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ شائع ہو رہی تھیں اور جس کا ذکر شراب خانوں

سے لے کر سوکھی پگڈنڈیوں تک، ایک گھوڑ سوار سے دوسرے گھوڑ سوار تک ہر قریہ ہر گاؤں میں، ہر اصطبل اور ہر الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے گوالوں میں ہو رہا تھا۔

اور جب کچھ لوگ میرے دفتر میں آئے جو مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر ساتھ والے ضلع میں تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر لے جانا چاہتے تھے تاکہ میں وہاں ان کے ڈپٹی کے زخموں کی مرہم پٹی کر سکوں جو اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا تھا۔ تو میں نے جمی کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ اس خبر کو چھپا سے پوشیدہ رکھے، حالانکہ میرے نزدیک یہ سب کچھ ایک واہمہ سے زیادہ نہ تھا، یہ براک چیمبرلین جو متعدد جرائم کے سلسلے میں اشتہاری مجرم بن گیا تھا، اب ہمارے علاقے کے نزدیک آکر ہمارا ہی مذاق اُڑا رہا تھا۔ اس نے بیس تیس اوباش آبادکاروں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ آخر ضلعی افسر نے جج چیمبرلین کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ خود تشریف لائیں اور اس لڑکے کو سمجھائیں کہ وہ اپنی یہ خطرناک کارروائیاں بند کر دے۔ میں جانتا تھا کہ یہ براک چیمبرلین وہی براک نہیں ہے جسے میں نے گہوارے میں پڑا ہوا دیکھا تھا۔ اور جس کے ملائم سنہری بال میرے سانس کی لرزش سے تھرتھرانے لگتے تھے۔

پھر مجھے جلدی ہی معلوم ہو گیا کہ میں غلطی پر تھا۔ صبح کی ٹرین آکر جا بھی چکی تھی۔ اور میں ابھی اپنی دواؤں کی چھوٹی چھوٹی شیشیاں بھر رہا تھا اور آلاتِ جراحی سنبھال رہا تھا کہ میں نے اپنے دفتر کے باہر قدموں کی چاپ سنی اور جب

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہاں لوٹی بروٹن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر اتنی موٹی کالی نقاب پڑی ہوئی تھی کہ میں اس نقاب کے پیچھے چھپے ہوئے ایک نقش کو بھی نہ پہچان سکا۔ اور اس نے ایسے کپڑے پہن رکھے تھے کہ میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ لیکن اس کے ہیٹ کے پَر کچھ ایسے عجیب زاویے میں اوپر اٹھے ہوئے تھے کہ میرے کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔

"ہال!" اس نے اپنی مخصوص آواز میں کہا۔ جسے میں نے پندرہ برس سے نہ سنا تھا۔

میں اپنی آنکھوں یا کانوں کے بغیر بھی لوٹی کو پہچان سکتا تھا۔ اس نے مجھے کئی نسلوں پرانے خاموش انداز گفتگو میں، محض ایک لفظ "ہال" کہہ کر وہ باتیں سنادی تھیں جو نہ ہونٹ ادا کر سکتے ہیں نہ کر سکیں گے۔ عطریات کی خوشبو نے ایک مرتبہ پھر مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت نفیس و لطیف اور غیر مرئی بادل کمرے میں چھا گیا ہے اور میں ایک بار پھر اس دنیا میں آ گیا تھا جو میرے ذہن میں بسی ہوئی دنیا سے دس ہزار گنا بڑی تھی۔ اس بڑی دنیا میں میں ابھی تک لمبے بالوں والا محض ایک گوالا تھا۔ لوٹی بروٹن یہاں سے کبھی نہیں گئی تھی۔ اور میرے چچا اب بھی اپنے ہیجانی شباب میں گھوڑے پر چڑھے علاقہ کا دورہ کرتے تھے۔

اس نے انگلیوں سے نقاب پکڑ کر اوپر اٹھائی۔ مگر اپنی جوانی کے پراشتیاق اور جارحانہ انداز میں نہیں (جو مجھے اب تک یاد تھا) بلکہ مدافعانہ انداز میں، اس کے چہرے پر پیلاہٹ اور مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر

اس کے جانی دشمن یعنی بڑھاپے نے اپنی پہلی پہلی نشانیاں دکھانا شروع کر دی تھیں۔ اور ایک دم جیسے اُسے یہ احساس ہو گیا کہ میں نے اس کے بڑھاپے کو پالیا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور میری طرف تنقیدی مگر خوشامدانہ انداز میں دیکھنے لگی۔ اس نے مجھے بتایا کہ مجھے ایک ڈاکٹر کی حیثیت میں دیکھ کر اُسے بڑی خوشی ہو رہی ہے بلکہ وہ کچھ فخر سا محسوس کر رہی ہے۔ اور یہ کہ ہر عورت مجھے محض دیکھ کر ہی اپنا علاج مجھ سے کرائے گی اور یہ کہ چونکہ ایک ڈاکٹر کے کان مریضوں کی چیخوں اور آہوں سے بھرے ہوتے ہیں اس لئے مجھے اس سے یہ بیزار کُن سوال نہیں پوچھنا چاہیئے کہ وہ اس عرصے میں کہاں کہاں رہی ہے"!

اور میں برابر اس کے شان دار اور جان دار چہرے کو تک رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں اپنے آپ سے یہ پوچھ رہا تھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ میں نے چند منٹ پہلے اس کے چہرے پر بڑھاپے کے آثار دیکھے تھے۔ اس عرصے میں وہ مجھ، سارہ بیٹ اور اس کے شوہر کے بارے میں سوالات کی بوچھاڑ کرتی رہی۔ اس نے براک کا نام تک نہ لیا۔ اس سے میں نے اندازہ کر لیا کہ ہو نہ ہو براک ہی اسے لایا ہے۔ معاً مجھے یہ جان کر بڑا تعجب ہوا کہ میں برسوں کے بعد یہ سوچ رہا تھا کہ پندرہ برس پہلے اس شام تینوں بچے اپنے اپنے سوتے کے کپڑے پہنے ___ اپنی ماں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے میں موم بتی کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ماں نے نئے قیمتی کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پہ ہیٹ تھا۔ ہاتھوں میں دستانے تھے۔ اور وہ اپنے بچوں

سے کہہ رہی تھی کہ وہ ایک سفر پر جا رہی ہے۔ [illegible]
اور ان کے لیے دو دو تحفے بھیجے گی۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ گلی کے [illegible]
لوگ ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ کسی نے [illegible]
پہچان لیا ہوگا۔ پھر مجھے اپنے دفتر کے باہر [illegible]
سنائی دی۔ سفید بالوں والی دراز قد [illegible]
اس کے باوقار چہرے پر جوش و [illegible] چھایا ہوا تھا۔

"ڈاکٹر! میں نے سنا ہے کہ [illegible]
سے چمٹ گئیں۔

باہر سے مجھے اپنی چار پہیوں والی چھوٹی [illegible]
جو ابھی ابھی اصطبل سے آئی تھی۔

"آئیے ڈاکٹر صاحب" [illegible]

میں اپنے ڈاکٹری کے تھیلے میں [illegible]
لوٹ کر کہا: "میرا بلاوا آگیا ہے۔ [illegible]
بھی آپ مسز [illegible] کے ہاں ٹھہرنا چاہتی ہیں [illegible]
کے پاس آؤں گا۔"

میں نے اپنی طرف سے [illegible]
قریب ہی ایک [illegible]
گلے پر بنے ہوئے خون کے [illegible]

گیا کہ اس کے حساس ذہن نے اسی وقت یہ اندازہ کر لیا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ اور اس جنوبی ضلع میں جاتے وقت وہ شخص ساری رات اونگھتا رہا اور میں سخت گرمی میں تپتا ہوا لوئی برونٹن کی کالی چمک دار آنکھوں سے نکلتی ہوئی دو ناقابلِ فراموش نگاہوں کو دیکھتا رہا۔ ایک نگاہ تو وہ تھی جو میں نے اس کی آنکھوں میں اس وقت دیکھی تھی جب اس نے دیوار پر میرے چچا کی فریم میں لگی ہوئی تصویر دیکھی تھی۔ تصویر میں بھی وہ بوڑھے تھے۔ گوشت سوکھ چکا تھا اور ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ وہ اپنی بگھی کے آگے گھوڑوں کی راسیں تھامے ہوئے بیٹھے تھے۔ دوسری نگاہ وہ تھی جو اس نے اب چلتے وقت مجھ پر ڈالی تھی۔ اس نگاہ کا تعلق دنیا کی کسی چیز سے بھی نہیں تھا۔ اور اگر تعلق تھا تو صرف اس ننھے سے بچے سے جو سونے کے ڈھیلے کپڑے پہنے موم بتی کی دھیمی روشنی میں اپنے سنہری ملائم بالوں کو بکھرائے ایک ایسی دنیا کے گہوارے میں بیٹھا ہوا تھا جو گذشتہ سال کی برف کی طرح غائب ہو چکی تھی۔

۱۵ — اتوار کی صبح کو میرے گھوڑے کے نعل دوبارہ سالٹ فورک کے بازاروں کی بھوری ریت پر اپنے نشان چھوڑ رہے تھے۔ دکانوں کے باہر لکڑی کے تختے پڑے ہوئے تھے، کاروباری مقامات کے دروازے بند تھے

اور ہر چیز پہ ایسی عجیب و غریب خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان سفید پتھری گیلریوں اور بھوری گھر بلو دیواروں نے کل شام رقص گاہ کے بے ہنگم ہنگامے یا بندوقوں کے شور کو نہیں سنا تھا یا علی الصبح گزری ہوئی رات کے میلے بخارات کو خاموشی سے درخت اور حوض سے اٹھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

حتیٰ کہ جب میں اپنے گھوڑوں کو دوڑاتا ہوا ڈیگیٹ کے اصطبل پہنچا تو وہ بھی اتوار ہی کا دن تھا۔ گھوڑے اپنے اپنے استھانوں پر کھڑے بڑے اطمینان سے دانہ چبا رہے تھے۔ اور جب میں اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے شیو بنا رہا تھا اور بعد میں جب پلا زا کو عبور کر رہا تھا اور بڑی بڑی دیواروں والے گرجا کی گھنٹیاں میرے کانوں میں بجتی رہی تھیں تو سارا وقت مجھ پر یہی خوف طاری رہا تھا کہ لوئی بروئن سے ملاقات کرنی ہے۔

پھر میں نے بیندروڈ کا دروازہ آہستہ سے کھٹکھٹایا، اس دروازہ کے باہر ایک ایسی بلّی لگی ہوئی تھی کہ اس سے پہلے میں نے کہیں نہ دیکھی تھی۔ دروازہ خود لوئی بروئن نے کھولا تھا۔ اسی طرح نازک اندام، اسی طرح سیدھی کھڑی ہوئی، بالکل کمان کی طرح تنی ہوئی، صرف کلغی دار ہیٹ کے پروں میں کچھ فرق آگیا تھا۔ جراب کسی قدر جھک گئے تھے۔ سفید چہرے پر لگی ہوئی سیاہ آنکھوں میں جوش کی سُرخی دوڑی ہوئی تھی۔

"ہاں! اس وقت مجھے کسی کے متعلق کچھ نہ بتانا، تم مجھے گرجا لے چلو۔ میں

عشائے ربانی کی دعا میں شریک ہونا چاہتی ہوں۔ مائرا نہیں جا سکتیں۔ اور میں یہ نہیں چاہتی کہ لوگ مجھے اکیلی کو تکتے رہیں۔"

میں اور میرے چچا گرجا بہت کم جاتے تھے۔ اور آج بھی میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر بچ سکتا تھا۔ میں اس سے پہلے لوٹی برونٹن کے ساتھ کبھی باہر نہیں گیا تھا۔ خاص طور پر جب وہ دوسرے لوگوں کی قربت کے خیال سے کچھ خوف کھا رہی تھی۔ حالانکہ وہ کبھی لوگوں کی ذرا بھی پروا نہ کرتی تھی۔ لیکن آج جب لوگوں نے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا تو اس نے اپنے جذبے کا اظہار صرف اس طرح کیا تھا کہ میرے بازو پر گرفت اور مضبوط کر دی تھی۔ جیسا کہ ایک دفعہ اس نے پہلے بھی کافی عرصہ پہلے اس دن کی تھی۔ جب ہم اس مقتول آبادکار کی لاش کے پاس سے گزرے تھے جو گاڑی کے بھوسے پر پڑی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر ایک نیلا رومال پڑا ہوا تھا۔

اور جب ہم نیم تاریک گرجا میں پہلو بہ پہلو جا بیٹھے جہاں موم بتیاں بڑے مقدسانہ انداز میں جل رہی تھیں اور عبادت گاہ کی دھیمی دھیمی روشنی تاریک قربان گاہ کو جگمگا رہی تھی، مجھے یوں لگا جیسے اُسے میری موجودگی کا احساس ہی نہیں ہے۔ اس کی تسبیح کے دانوں کے گرنے کی آواز میرے کانوں میں بندوق کی گولیوں کی طرح آ رہی تھی۔ اور اس کے ہونٹ اس ہوا کی طرح ہل رہے تھے۔ جو زنگ آلود خاردار تاروں اور پھولوں میں سے آہستہ آہستہ گزر رہی ہو۔ گرجا کی سفیدی پھری اُجلی دیواریں دھند کی طرح آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہی تھیں اور میری آنکھوں کے سامنے بجائے قربان گاہ کے

جنوب کا وہ بنجر علاقہ گھوم رہا تھا جہاں میں گذشتہ چند دنوں میں اپنی گھوڑا گاڑی دوڑاتا رہا تھا۔ سارا علاقہ بے رحم سخت دھوپ میں ننگا پڑا جلتا رہتا تھا۔ شکستہ دل آبادکار اپنے مقبوضہ گڑھوں اور خالی خولی گھر ندوں کے دروازوں کو کھڑے، جن کے قبضے ڈھیلے پڑ گئے تھے میری چار پہیوں والی گاڑی کو بڑے اشتیاق سے دیکھتے رہتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے ہلوں میں بیکار پڑے پڑے زنگ لگ گیا ہے اور طاقتور گھوڑے اس خالی زمین پر بے حس و حرکت بیکار کھڑے ہیں جہاں کبھی ہری ہری گھاس لہلہایا کرتی تھی۔ اور وہاں ریت کے تودے کے تودے احاطوں میں روزانہ اُڑتے رہتے ہیں۔

اور جب میں اپنا سفر ختم کرنے والا تھا تو میں نے دیکھا کہ مجروح اشخاص وہسکی چڑھائے نیم عریاں حالت میں ایک سوکھے ہوئے سیب کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے جس میں کوئی پتّا نہ تھا نہ کوئی ایسی چیز تھی جسے ٹہنی کہہ سکیں۔ میرے دیکھتے دیکھتے ایک اور ٹیلا دھوپ کی گرمی سے چٹخ کر شق ہو گیا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان ریتلی پہاڑیوں کے چاروں طرف لوگ بھری ہوئی رائفلیں لئے تیار کھڑے ہیں۔ اور وہ اس مقتول آبادکار کی جھونپڑی کی پہرہ داری کر رہے ہیں جو اب اپنی کھلی ہوئی کھڑکیوں کے باوجود ویران پڑی ہوئی ہے۔

چیمبرلین ابھی تک وہاں نہ آیا تھا، اور اس وقت ہم یہ تصور بھی کر سکتے تھے کہ وہ عین اس وقت کسی نامعلوم قانونی اور عدالتی کام کے سلسلے

میں سانٹنا فی آنے والی ٹرین پر سوار ہو رہا ہوگا۔ اور جب سورج غروب ہوگیا اور پگڈنڈی پر ایک گھوڑے کی ٹاپ سنائی دینے لگی تو ہم سب یہی سمجھے کہ جج آگیا ہے، ورنہ کم از کم اس کی طرف سے کوئی نہ کوئی پیغام تو ضرور آیا ہوگا۔ حتیٰ کہ جب گھوڑے کی ٹاپ سے یہ معلوم ہوا کہ بگھی نہیں ہے اس وقت بھی ہمارا یہی خیال تھا کہ جج ہے۔ اور جب وہ ٹاپ تاروں بھری چھاؤں میں سمت مغرب سے چلتی ہوئی اور قریب آئی تو مجھے وہ گھوڑسوار کچھ مانوس سا معلوم ہوا جو زین سے کسے ہوئے ابلق گھوڑے کی پیٹھ پر آگے کو جھکا ہوا تھا۔

لوگوں نے پہلے تو ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور پھر سب نے مڑکر اس آنے والی پرچھائیں کی طرف دیکھا۔ اب میں اپنے چچا کی صورت کو صاف صاف دیکھ رہا تھا، وہ اپنی دل پسند چاندی کے کناروں والی گدی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک تھکا ہارا بوڑھا شخص جس کا موٹے کپڑے کا کوٹ اس کے سوکھے ہوئے بدن اور سکڑے ہوئے کندھوں کے مقابلے میں بہت ڈھیلا تھا۔ کوٹ کے پچھلے دامن گھوڑے کی زین پر پھیلے ہوئے تھے ان کی پتلون کے پائنچے گرد آلود لمبے جوتوں میں ٹھنسے ہوئے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ انھیں برک کے بارے میں کس شخص نے اطلاع دی تھی۔ لیکن یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے مویشی خانہ سے سیدھے اس راہ پر ہو لئے تھے، جس کے دونوں طرف سوکھے ہوئے درخت کھڑے تھے اور جہاں کوئی ایسی پگڈنڈی نہ تھی جس پر بگھی چل سکتی، ان کے ابلق گھوڑے

کی ٹانگیں رانوں تک کیچڑ میں لت پت ہوگئی تھیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ انھیں قریب وہ دلدلوں میں سے بھی گزرنا پڑا تھا۔ اور اُن کا وہ کمبل جو گدّی پر سے کسی قدر پھیلا ہوا تھا۔ پسینے کی وجہ سے بالکل کالا ہوگیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ہمارے قریب ہی آکر رک گئے۔ ان کا بڑا چہرہ اپنی لمبی لمبی سفید مونچھوں کے ساتھ ان کی پسینے میں بھیگی ہوئی میلی قمیص پر جھکا ہوا تھا جو سینے سے چپکی ہوئی تھی۔ ان کی آنکھوں سے چنگاریاں برس رہی تھیں، اور وہ ہماری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جو آنکھوں سے نہیں بلکہ دماغ کی ان گہرائیوں سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں جہاں زندگی اپنے آخری ایام کو پہنچ چکی تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے ہم میں سے کسی کو پہچان لیا تھا یا نہیں، کیونکہ انھوں نے کسی قسم کا کوئی اظہار نہ کیا تھا۔ اور میری طرف جو توجہ انھوں نے کی، اس سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میں بردٹن خاندان کے گوشت پوست سے بنا ہوا نہیں ہوں بلکہ محض ایک اجنبی ہوں۔

"براک کہاں ہے؟" انھوں نے صرف اتنا پوچھا۔

لوگ بڑی بے چینی سے اپنی اپنی جگہ پر ہلے، ایک شخص نے اس جگہ کی طرف اشارہ کر دیا جہاں براک تھا۔ چند لمحوں کے لئے ان کی بوڑھی آنکھیں اس ویران اور خستہ جھونپڑی کی طرف تکتی رہیں جو ان تمام چیزوں کی علامت تھی جن سے انھیں نفرت تھی اور جس نے انھیں دُکھ اور پریشانیوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ پھر اُن کے جھرّیوں پڑے گھٹنوں نے گھوڑے کو چلنے کے

لئے متوجہ کیا اُن کی بوڑھی انگلیوں نے جو اب ہڈیوں، رگوں اور کھال کے سوا اور کچھ نہ تھیں لگامیں سنبھالیں اور تھکا ہارا پھر چل پڑا۔

افسرِ ضلع نے آگے بڑھ کر ان کی لگام پکڑ لی "آپ وہاں نہیں جا سکتے جب تک جج چیمبر لین نہ آجائیں"۔

تھوڑی دیر کے لئے تو یوں لگا جیسے میرے چچا اس کا مطلب نہیں سمجھے ہیں۔ جیسے ان کے وجود کے کسی اندرونی گوشے میں اس نام کو داخل ہونے میں کافی دیر لگ گئی۔ جہاں زندگی کی بھرپور قوتیں ابھی تک تاک لگائے بیٹھی تھیں۔ پھر انھوں نے اپنا موٹے بالوں والا سر یوں بلند کیا جیسے بڑے بڑے سینگوں والا بچھڑا سر اٹھائے بھیڑیوں یا پانی کو سونگھتا پھر رہا ہو۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی انہیں اپنے سر کو یوں آہستہ آہستہ بلند کرتے نہ دیکھا تھا۔ لیکن جب ان کا پورا چہرہ اوپر اٹھ گیا تو میں نے ایک عجیب و غریب احساس کے ساتھ جسے بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں یہ دیکھا کہ اس بوڑھے جنگجو سپاہی کے ڈھانچے میں اب بھی طوفان، آندھیاں اور بجلیاں چھپی ہوئی ہیں۔ ان کی کالی گہری آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں برس رہی تھیں اور ان کے چہرے پر پھر وہی عزم، ارادے اور مطلق العنانی کی ناقابلِ فراموش سیاہ لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔

اب انھیں ایک درجن افسرانِ ضلع بھی نہیں روک سکتے تھے۔ چنانچہ ہم میں سے کسی نے بھی انھیں روکنے یا ان سے کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنی گدی پر سیدھے اکڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ اُن کا دایاں ہاتھ مضبوطی سے

اُن کے پہلو میں لٹکا ہوا تھا، جس کا انگوٹھا زین کے کونے سے کھیل رہا تھا کہ زمانۂ جنگ سے ان کی یہی عادت تھی۔ پھر وہ اکیلے ہی اس سنسان جھونپڑی تک گئے۔ جہاں ایک دھیمی مرتی ہوئی آواز نے، جو ہم بمشکل سن پاتے تھے ان کا استقبال کیا اور ان سے یہ صاف صاف کہہ دیا کہ وہ مرجاتے گا لیکن کبھی اپنے آپ کو عدالت میں پیش نہ ہونے دے گا اور یہ کہ وہ بوڑھا آدمی اب اس کا باپ نہیں ہے اور یہ کہ اگر وہ اور نزدیک آئیں گے تو وہ گھوڑے کو بھی اور گھڑ سوار کو بھی پگڈنڈی ہی پر ہلاک کر دے گا۔

میرے چچا نے کوئی جواب نہ دیا۔ ان میں صرف یہ تبدیلی آئی تھی کہ وہ اپنی رکاب میں پاؤں ڈال کر ذرا اور اوپر ہو گئے تھے۔ وہ مجھ سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر تھے ان کی پیٹھ میری طرف تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت بیس سال پیچھے چلا گیا ہے۔ افق پر گھاس کے بڑے بڑے جھنڈ جیسے ناگوں کی طرح کنڈلیاں مارے بیٹھے ہیں۔ اور جیسے ہرنوں کی ایک ڈار میرے چچا کے گھاس کے سمندر پر قلانچیں بھرتی جا رہی ہے۔

وہ اس ویران جھونپڑی میں صرف چند منٹ ہی رہے ہوں گے، پھر انھوں نے باہر نکلتے وقت اپنے مخصوص تحکمانہ انداز میں مجھے آواز دے کر پکارا۔ جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک شخص جس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی دیوار کا سہارا لئے ہوئے بیٹھا ہے۔ اس کے ایک طرف رائفل اور دوسری طرف پستول ہے۔ وہ میری طرف دیکھ کر استہزائیہ انداز میں ہنس رہا تھا۔ اس کے سنہری بال، بچوں کے بالوں کی طرح گھنگریالے تھے۔ میں دروازہ سے آتی ہوئی دھیمی

روشنی میں چمکتے ہوئے اس کی چھاتی پر لگے ہوئے زخم کا خون بند کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے مصافحہ کرنے کی بھی خواہش کر رہا تھا۔ میرے چچا اڈیبت ناک سنگ دلی سے کھڑے ہوئے تھے۔ برابر برابر میرا مذاق اڑاتے ہوئے گندے فرش پر لیٹ گیا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ خاموش پڑا رہے اور یوں میرا مذاق نہ اڑائے۔ لیکن اس نے میری درخواست کو درخور اعتنا نہ سمجھا کبھی وہ مجھے مویشیوں کا ڈاکٹر کہتا۔ کبھی تمباکو اور سگریٹ مانگنے لگتا۔ جمی کی خیریت پوچھنے لگتا۔ اور مجھ سے التجائیں کرتا کہ میں سارہ ہیٹ سے اس کے متعلق اچھی اچھی باتیں کہوں۔ اس کی باتیں سن کر ہر شخص کا دل حتیٰ کہ اس ضلعی افسر کا دل بھی پسیج رہا تھا جو دروازہ سے چند فٹ کے فاصلے پر خاموش کھڑا ہماری باتیں سن رہا تھا۔

باہر سے آتی ہوئی دھیمی روشنی میں میں نے دیکھا کہ جب اس میں مزید بولنے کی ہمت نہ رہی اور گیدڑوں کے رونے کے سوا کسی چیز کی آواز نہ آ رہی تھی۔ تو اس نے اپنی زہر بھری نیلی آنکھوں سے اپنے پیچھے کی کسی چیز کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا، اس جھونپڑی پر اس قدر باقاعدگی سے گولیاں چلائی گئی تھیں کہ یہ سچ مچ کی چھلنی بن کر رہ گئی تھی۔ صرف ایک دیوار کا ایک حصہ ایسا تھا جو گولیوں کی بوچھاڑ سے محفوظ رہ گیا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ میری توجہ اسی حصے کے عین بیچ میں کسی نامعلوم شخص کے چپکائے ہوئے ایک کرسمس اخبار کی طرف دلا رہا تھا جس پر حضرت مسیح کا یہ مشہور قول لکھا ہوا تھا: "زمین پر امن و امان کا دور دورہ رہے اور انسان

ہمیشہ خوش رہیں "

گھنٹی بجنے اور لوگوں کے کھڑے ہونے کی آوازوں نے میری آنکھوں کے سامنے دوبارہ چرچ کی سفیدی پھری دیواروں کو لا کھڑا کیا۔ لوئی بروٹن میرے پہلو میں تھی۔ اور جب میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو مجھے یہ احساس ہوا کہ تقریباً سب لوگ جنوبی علاقہ کی اس واردات سے واقف ہیں۔ ان کی نظریں لوئی بروٹن کی طرف سوالیہ انداز میں جمی ہوئی تھیں جیسے وہ اپنے کئے پر پچھتا رہے ہوں جیسے وہ یہ سوچ رہے ہوں کہ انھوں نے دھوکا دیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا حساس ذہن لوگوں کے اس نئے قسم کے احترام کو محسوس کر رہا ہے اور اس کا جواب بھی دے رہا ہے۔ اور جب دعا کی ساری رسوم ختم ہو گئیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوبارہ ایک پاک اور خالص شمع بن گئی ہے جو کسی ایسی چیز سے جل رہی ہے جو تیل سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔

چرچ سے باہر نکلنے کے بعد اس نے اپنی نقاب اٹھالی اور ان چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کی طرف دیکھ کر بڑی شیرینی سے مسکرانے لگی جو درمیانی نشستوں اور دروازوں میں سے اپنا راستہ بناتے وقت اسے بڑی مانوس نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے ایک کالی شال والی میکسیکو کی عورت سے گفتگو بھی کی جو اب بوڑھی ہو چکی تھی۔ اور جس کا نام جہاں تک مجھے معلوم ہے لاسیجا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بڑھیا لوئی بروٹن کے تیز طرار انگریزی کے جملوں کو کبھی نہیں سمجھی ہو گی۔ البتہ لوئی سے باتیں کرتے وقت

اس کے جھرّیوں بھرے چہرے اور اس کی بجھی ہوئی اندھی آنکھوں سے یوں لگتا تھا جیسے اس نے کسی ایسی شخصیت سے گفتگو کی ہے جس نے خود اپنی آنکھوں سے کنواری مریم کو دیکھا تھا۔

لیکن آج وہ اس میٹھی، دلکش اور تیز طرار آواز کو سن کر جسے اس نے پندرہ برس سے نہ سنا تھا تڑپ اٹھی۔ اور اپنے ساتھی کا ہاتھ چھوڑ کر اس آواز والی کے پاس آئی۔ اور آتے ہی اپنے فولاد جیسے سخت ہاتھوں سے لوئی بروڈن کے سفید اور نازک ہاتھوں کو جکڑ لیا۔

"میرا بیٹا بھی جا چکا ہے۔" اس نے بڑھیا سے کہا۔ ہسپانوی زبان کا ایک دھارا تھا جو ارد گرد کھڑی ہوئی تمام عورتوں کے دلوں پر چھا گیا۔

لوئی بڑی نزاکت سے ہمدردانہ انداز میں کھڑی تھی اور مجھ سے نظروں ہی نظروں میں اس ہسپانوی جملے کا مطلب پوچھ رہی تھی۔ لیکن جب میں نے اس کا مطلب بتائے بغیر اسے آگے چلنے کو کہا تو وہ میکسیکو کے ایک جوان شخص کی طرف مڑی جو جان کنگ تین کے گودام میں پیسے بنایا کرتا تھا، اس نے پوچھا "یہ اندھی عورت کیا کہتی ہے؟"

"یہ کہتی ہے!" اس جوان شخص نے سب کو یہ دکھانے کے لئے کہ وہ لوئی بروڈن سے گفتگو کر رہا ہے۔ اپنی کمر میں فخر و غرور کا ایک بل ڈال لیا" یہ کہتی ہے کہ اس کا بھی ایک بچہ تھا جسے کسی نے گولی سے ہلاک کر دیا ہے۔ یہ کہتی ہے، خدا کا شکر ہے کہ دونوں بچے اب اس دنیا کی مصیبتوں سے نجات پا گئے۔"

"ہاں اسے کہہ دو کہ میں اس کا شکریہ ادا کرتی ہوں" لوٹی نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

وہ دوبارہ سیدھی کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کا رنگ بالکل پیلا پڑ گیا تھا۔ اس نے میرے بازو میں اپنا بازو ڈالا اور اُن لاتعداد لوگوں سے بچ بچ کر راستہ بنانے لگی جو اب بھی قدیم دیواروں والے چرچ سے بھونروں کی طرح نکل رہے تھے۔

اس نے کہا "اب میں مویشی خانے جانے کے لئے تیار ہوں کیا تم ڈیگیٹ کے اصطبل سے کسی آدمی کا انتظام کر سکتے ہو جو مجھے چھوڑ آئے؟"

میں نے التجائیہ انداز میں اس سے کہا "جب تک تجہیز و تکفین نہ ہو جائے میں وہاں نہیں جاؤں گا۔"

اس کے ہیٹ کے پَر اچانک سیدھے ہو کر بلند ہو گئے۔

"اچھا تو میں تو آج جا رہی ہوں" اس کی تیز، واضح اور نوکیلی آواز اسی اثر کرنے والے انداز میں مجھے مجبور کر کے اصطبل کی طرف لے گئی۔ جس انداز میں کہ اس نے بیس برس پہلے سالٹ فورک کی عدالت میں جاہل لوگوں کو اپنا ہیٹ سر سے اتارنے اور ہم دونوں کے لئے راستہ بنانے کے لئے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

جب لوٹی چلی گئی تھی تو میں نے اپنے ذہن میں سینکڑوں مرتبہ یہ تصویر بنائی جیسے لوٹی برونٹن واپس آ گئی ہے۔ اور میں اپنے تصورات میں گھرا ہوا ہمیشہ وہ غیر معمولی جذبہ محسوس کیا کرتا تھا جو محض اس کی طرف دیکھنے ہی سے

میرے دل میں جاگ جایا کرتا تھا۔ لیکن آج میں لوئی ٹبروٹن کے ساتھ مویشی خانہ نہیں جانا چاہتا تھا۔ ڈیگیٹ کے اصطبل کی طرف جاتے وقت میرے سامنے چچا کی خوفناک دہکتی ہوئی وہی انگارہ آنکھیں پھر رہی تھیں جنھیں میں نے کل ہی جنوب کے ساتھ والے ضلع میں دیکھا تھا۔

جب میں نے فرینک ڈیگیٹ سے اپنی چار پہیوں والی گاڑی کے لئے "تازہ دم گھوڑے" مانگے تو اس نے میری طرف عجیب نگاہوں سے دیکھا اس نے یقیناً یہ اندازہ کر لیا ہوگا کہ میرے ساتھ کون جا رہا ہے۔ ابھی تو اس نے لمبی کھونٹیوں پر سے اپنی بہترین سیاہ کاٹھی اتاری تھی۔ اور اپنے سب سے تیز رفتار گھوڑوں کی کمر پر رکھی تھی۔ کہنے لگا میری پرانی گاڑی کے ایک پہیئے کا دُھرا کچھ ڈھیلا ہے اس لئے وہ آج مجھے سبز سیٹوں والی شاندار نئی بگھی دے گا جو اس نے پچھلے ہفتے ہی منگوائی ہے۔ میرے وہاں سے چلنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر مجھے دکھانے کے لئے گھوڑوں کی ایالوں اور دُموں پر ہاتھ پھیرا۔ اور مٹی کے ذرات کو جھاڑا۔

"لوئی کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"ہاں ٹھیک ہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اب بوڑھے کرنل کے پاس جانا بڑی دلیری کا کام ہے۔ بالکل ڈھٹائی کا کام ہے۔ مگر اس وقت بھی وہ دلچسپ ہی تھی۔" اس نے اس وقت کہا جب میں بگھی پر چڑھ رہا تھا۔

ہمارے جنوب مغربی علاقے میں کچھ دن ایسے بھی آتے ہیں جنھیں لوگ پتیلی کہتے ہیں۔ حالانکہ انھیں آہنی کہنا چاہیئے۔ سورج کی تیز شعاعیں بڑی بے رحمی سے آگ کے گولے برساتی رہتی ہیں اور بغیر بادلوں کا صاف نیلا آسمان خنجر کی دھار کی طرح معلوم ہونے لگتا ہے جسے دنوں پتھر پر گھس کر تیز کیا گیا ہو۔ دھوپ اور گرمی سارا دن علاقے کے سانس لیتے ہوئے زندہ جسم کو کاٹتی رہتی ہے۔ ہڈیوں کو بالکل راکھ کر دیتی ہے۔

میں ایک ایسی ہی صبح اصطبل کے سامنے والے بڑے دروازوں سے بگھی لے کر نکلا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ لوٹی برودٹن یہ تو ضرور پوچھے گی کہ میں نے اپنا ارادہ کیوں بدل لیا ہے۔ اگرچہ مائرہ اینڈ روڈ نے مجھے الوداع کہتے وقت بڑی مایوس اور اداس نظروں سے دیکھا تھا لیکن لوٹی برودٹن اسی نزاکت، نفاست اور دل کشی کے ساتھ اس کے کمرے سے باہر نکلی جیسے وہ اب یہاں کبھی نہ آئے گی پھر اس نے بگھی تک لے جانے کے لئے مجھے اپنے تھیلے وغیرہ یوں دیئے جیسے وہ مویشی خانہ سے اسی لئے آئی تھی کہ واپس جائے گی۔ اور ابھی چند روز پیشتر اس نے چیزوں کو جس طرح چھوڑا تھا، وہ اسی طرح اپنی اپنی جگہ رکھی ہوئی ملیں گی۔ جب ہماری بگھی چلنے لگی اور قصبے کے لوگ کھڑے ہو ہو کر اسے دیکھنے لگے تو اس نے کوئی توجہ نہ دی اور یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف تکتا دیکھ رہی ہے۔ اور جب ہم اپنے سبزہ زار میں پہنچ گئے تو اس نے اپنا رُخ آباد کاروں کے خیموں کے برخلاف رکھا ہوا تھا۔ اور وہ مسلسل اپنی نیچی، لوچیلی آواز میں

باتیں کئے جا رہی تھی - جیسے وہ چاہے بھی تو ٹھہر نہیں سکتی - اس کی باتوں میں چھپے ہوئے کسی لفظ یا جملے سے مجھے یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ اس عرصے میں کہاں رہی ہے اور کیا کرتی رہی ہے! لیکن مجھے بعد میں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ لوگ اس کے متعلق جو داستانیں سنایا کرتے تھے اُن میں سے کون سی سچی تھی!

لوسیؔ صرف شام کے وقت خاموش ہوئی جب ہمیں مولیشی خانہ کی عمارتیں اور درخت یوں دکھائی دینے لگے جیسے وسیع و عریض تپتے ہوئے صحرا میں اچانک کوئی نخلستان آگیا ہو - اس نے اس وقت بھی کوئی بات نہ کی جب ہم بن سٹی اور سفید اور گلابی پھولوں کی ان جھاڑیوں کی دیوار کے پاس سے گزر رہے تھے جو اس نے خود لگوائی تھیں - اور اس نے اپنی زبان سے اس وقت بھی کوئی لفظ نہ نکالا جب ہم مولیشی خانہ کی مانوس کالی دیواروں کے پاس جا کر ٹھہرے تھے - جن پر سامنے والی بڑی گیلری میں کھونٹی پر لٹکی ہوئی لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی پڑ رہی تھی -

معلوم ہوا کہ ابھی چچا جنوبی علاقے سے واپس نہیں آئے تھے جنھیں ہم سے ایک دو گھنٹے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہیئے تھا - لیکن جب لوسی بریڈ ٹن نے خود اپنے ہاتھوں سے موم بتیاں جلائیں اور اُن کی روشنی سے سارا مکان جگمگا اٹھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا مکان چچا کی موجودگی سے جگمگا رہا ہے - ان کی کارتوسوں کی کالی پیٹی ہال کمرے کے ایک کونے میں صنوبری کھونٹی پر لٹکی ہوئی تھی - ان کے شکن دار مضبوط جوتے سامنے والے اس سونے کے کمرے کی دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے تھے جہاں

لوٹی نے مجھے اپنے تھیلے رکھنے کو کہا۔ ان کے لوٹتے ہوئے جگہ جگہ بکھرے ہوئے پائپوں اور ہر چیز کی شدید ویرانی سے یہ احساس ہوتا تھا کہ چچا موجود ہیں۔

اس وقت میں یہ دعا مانگ رہا تھا کہ خدا کرے جی ریوڈار کے جنگل سے جلد لوٹ آئے جہاں آسے ایک گھوڑ سوار بلا کرلے گیا تھا۔ رات کا اندھیرا چھا رہا تھا لیکن وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ مگر کوئی ایک گھنٹے کے بعد ہمارے مویشی خانہ کے کارندے جنھیں لوٹی برروٹن کے آنے کی خبر مل چکی تھی اس کا استقبال کرنے کے لئے اور اسے سلام کہنے کے لئے جوق در جوق چلے آئے۔ وہ سامنے والی گیلری کے پاس قطار باندھے کھڑے تھے اور ایک پیش کار کو آگے بڑھنے پہ مجبور کر رہے تھے۔ اس وقت سب سنجیدہ اور کچھ گھبرائے ہوئے تھے۔ سب نے شیو کی ہوئی تھی اور دھلی ہوئی قمیصیں پہن رکھی تھیں جیسے آج کوئی تہوار ہو۔ ہیٹ اُن کے ہاتھوں میں تھے۔ اُن کے جوتوں کی آہنی ایڑیاں فرش پر رگڑ کھا کر عجیب آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ اور براک کی موت پر اور اس سے پہلے کے المناک واقعات پہ اور بوڑھے کرنل کی آمد پر آنے والے واقعات پر وہ شدید دکھ محسوس کر رہے تھے۔ لیکن ان کے پاس اس دکھ کو بیان کرنے کے لئے ایک لفظ بھی نہ تھا۔

ہر شخص ہاتھ ہلا ہلا کر سنجیدگی سے یہ کہہ رہا تھا "مسز برروٹن آج کا دن بڑا مبارک ہے"! یا یہ کہ "مسز برروٹن آپ کو راستے میں کوئی

تکلیف تو پیش نہیں آئی"۔ یا یہ کہ "مسٹر بروٹن آپ کا سفر خیریت سے گزرا ؟"

بس ایسی ہی چند باتیں کہنے کے بعد وہ مودّبانہ انداز میں خاموش کھڑے ہوگئے اور اس مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے جب انھیں یہاں سے چلا جانا چاہیئے۔ انھوں نے جو یہ چند باتیں بڑی مشکل سے کہی تھیں۔ بڑی احتیاط سے منتخب کی گئی تھیں۔ انھوں نے اپنی طرف سے کوئی ایسی بات نہ کہنے کی کوشش کی تھی جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ براک کبھی زندہ بھی رہا تھا یا اب مر گیا تھا۔ یا لوئی یہاں سے چلی گئی تھی۔ اس عرصے میں لوٹ بروٹن نے بھی اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی کہ وہ انھیں مزید پریشان نہ کرے۔ اس نے ان کے بے ترتیبی سے ادا کیئے ہوئے سیدھے سادے جذبے کو بڑے غور سے اس طرح سنا جیسے انھیں اپنی گرہ میں باندھ رہی ہو۔ ہوتے ہوتے لوگوں کا یہ جذبہ فریقین کے لئے اتنا اہم اور جوشیلا ہوگیا کہ لوگ اس شخص کو حیرت سے دیکھنے لگے جس نے سب سے پہلے اس کا اظہار کیا تھا۔

اور جب وہ مناسب وقت بھی گزر گیا جس کا وہ انتظار کر رہے تھے تو ان کے لئے یہاں سے جانا اتنا ہی دشوار ہوگیا جتنا یہاں آنا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک گوالا بار بار اپنا سر اٹھا کر دروازہ کی طرف دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ سب اس طرح تن کر کھڑے ہوگئے اور ان کے چہرے خوشامدی انداز میں اس طرح ساکت ہوگئے کہ اگر میرے کان نہ ہوتے تب بھی میں سامنے والی گیلری میں آنے والے قدموں کی چاپ سن لیتا۔ میں

نے ذرا غور سے دیکھا، چچا دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ تصویر آج تک میرے ذہن پر نقش ہے۔ سایوں میں سے ابھرتی ہوئی ایک ظالمانہ شکل جس کے ایک ایک نقش میں زبردست ارادے اور قوت کی بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ جس کی گہری کالی آنکھوں سے لال لال چنگاریاں برس رہی تھیں۔ چچا اب ہال کمرے کی طرف آ رہے تھے۔

اب گواسے رخصت ہو رہے تھے "شب بخیر مسز بروٹن !" وہ قطار باندھے اسی سمت چلے گئے جدھر سے آئے تھے۔ اور لوئی بروٹن وہاں اکیلی کھڑی رہ گئی۔ ایک نازک اور کمزور نسوانی جسم آنے والے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے تنہا کھڑا تھا۔

میرے چچا آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ اب بھی وہ ایک مطلق العنان جابر بادشاہ معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے موٹے کپڑے کا وہی لمبا کوٹ پہنا ہوا تھا جس کے پچھلے دامن لٹکے رہتے تھے، اور جب وہ ان روشنیوں کے پاس پہنچ گئے۔ اور جب وہ جھک کر لوئی کے ہاتھ پر بوسہ دینے لگے اور اسی پہلے والی انکساری سے اس کی خیریت پوچھنے لگے تو مجھے ان کی گردن پر ابھری ہوئی بڑھاپے کی موٹی موٹی رگیں صاف نظر آ رہی تھیں، لیکن ان کا جھرّیوں بھرا چہرہ ایک مصنوعی نقاب معلوم ہوتا تھا۔ ان کی آواز اتنی بھاری تھی جیسے بڑے بڑے پتھر گر رہے ہوں۔ میں جانتا تھا کہ جس طرح ضلع سالٹ نورک کے تمام لوگ لوئی سے یہ موضوع چھیڑتے ہوئے گھبراتے تھے کہ وہ اس عرصے میں کہاں رہی ہے

اور کیا کرتی رہی ہے۔ اسی طرح میرے چچا بھی کم از کم فی الحال اس موضوع سے کترائیں گے۔

اور میرا خیال ہے کہ یہ بات لوٹی بروقت بھی جانتی تھی۔ اس نے یقیناً اپنے طور پر یہ سوچا ہوا تھا کہ اس سے جرح نہیں کی جائے گی، اور نہ اسے ساری کہانی سنانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ جیسے وہ محض ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ محض اسی خیال سے اس کی آنکھیں زیادہ روشن اور چمکدار ہو گئی تھیں۔ اور اس نے اپنا چھوٹا سا سر جس پر کالے بالوں کا ایک ڈھیر تھا۔ بڑے ہی دلفریب زاویے میں اوپر اٹھایا ہوا تھا۔ وہ اپنی پرانی خوش مزاجی اور زندہ دلی سے مگر کسی قدر سنجیدگی اور بے ربطی سے چچا کی خیریت پوچھ رہی تھی۔ اور یہ پوچھ رہی تھی کہ جمی کہاں گیا ہے۔ اور یہ بتا رہی تھی کہ اس نے مائرا کے ہاں جمی اور سارہ کی تصویریں دیکھی تھیں۔ اور کہہ رہی تھی آپ اتنے لمبے سفر سے بہت تھک گئے ہوں گے۔ کیوں نہ میں آپ کے لئے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کروں؟ اور جوں جوں میرے چچا کی آنکھوں میں ایسی باتوں اور ایسے سوالوں سے حرارت پیدا ہو رہی تھی وہ اور زیادہ تیزی سے بولتی جاتی تھی۔ پھر بولتے بولتے اس کا چہرہ اور زیادہ نازک اور بالکل ہاتھی دانت کی طرح سفید ہو گیا۔ اور اس پر کہیں کہیں خون کی بوندیں سی نظر آنے لگیں۔

آخر کار مجھ سے نہ رہا گیا، اور ادھر اتفاق سے چچا نے بھی مجھے دیکھ لیا تو میں جلدی سے قدم بڑھا کر ان کے پاس پہنچا اور لوٹی سے درخواست

کی کہ وہ ہمارے لئے قہوہ بنادیں یا باورچی کو جگادیں، وہ آگ جلا دے گا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کمرے سے چلے جانے کے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھائے گی۔ لیکن وہ وہیں کھڑی رہی۔ اس کا چہرہ اب اور بلند ہوگیا تھا جس کے سارے تیکھے نقوش اپنی تمام نزاکتوں اور باریکیوں کے ساتھ نمایاں ہورہے تھے۔ اور اس کی بے چین آنکھوں میں ایک ایسی نگاہ مچل رہی تھی جس کا مفہوم میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ پھر میں خود ہی دروازہ بند کرکے وہاں سے چلا گیا اور گودام کی طرف چلنے لگا جہاں ہمارے کارندے دُور دُور تک اپنی اپنی چارپائیوں پر پڑے سونے کی کوشش کرتے ہوئے سگریٹیں پی رہے تھے اور آہستہ آہستہ باتیں کررہے تھے اور ریجی کی گاڑی کا انتظار کررہے تھے۔

جب میں کوئی ایک یا دو گھنٹے کے بعد دوبارہ سامنے والی گیلری پر پہنچا تو ان قدیم دیواروں میں کوئی بہت ہی تیز کیمیادی تبدیلی واقع ہوگئی تھی۔ پرانے وسیع مویشی خانہ کی ہوا میں سگرٹوں کے اٹھے ہوئے پُرسکون دھوئیں کی بدبُو کے ساتھ ساتھ غازے اور عطر کی خوشبو بھی شامل ہوگئی تھی۔ ہال کمرے میں صنوبری صوفوں اور آرام کرسیوں پر دوبارہ بیش قیمت رنگین کمبل بچھا دئے گئے تھے۔ جس کے چاروں پھول چاروں کونوں پر سے لٹکے ہوئے تھے۔ اب میز کل صبح کے ناشتے کے لئے بالکل تیار تھی۔ نشست گاہ کی صفائی ہوچکی تھی۔ اور اب وہ آنے والے ریجی کے استقبال کے لئے بالکل تیار ہوگئی تھی جو کئی دن سے گھر سے گیا ہُوا

تھا۔ سنگ مرمر کی میزوں پر نئے میز پوش بچھا دیئے گئے تھے۔ اور کرسیوں کی پشت پر صاف ستھری پھول دار گدیاں لگادی گئی تھی۔ پیانو ابھی تک بند پڑا تھا۔ البتہ آرائشی پیتلی فرشی لیمپ کو روشن کر دیا گیا تھا، اور لیمپ کی چینی کی چمنی کے رنگین پھول پھر کھل اُٹھے تھے۔

پھر میرے چچا نے، جو اب تک ایک گھوڑے کے بالوں سے بھری ہوئی گدی دار آرام کرسی پر چپ چاپ بیٹھے رہے تھے ایک منہ زور سرکش گھوڑے کی طرح اپنا سر یوں اٹھایا جیسے انھیں کبھی کوئی مطیع نہیں کرسکتا۔ اُن کا ادھ جلا سگار دفعتہً اُن کے ہاتھ میں بے حس و حرکت ہوگیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ لوئی بروٹن بھی ہال کمرے سے سونے کے کمرے میں جاتی ہوئی یکایک ٹھہر کر، بے حس و حرکت کھڑی ہو گئی تھی۔ لپٹی ہوئی نیلی چادریں اس کے عریاں سفید بازوؤں پر پڑی ہوئی تھیں۔ ایک لمحہ کے بعد مجھے بھی دور جنوب مغربی آسمان کے تاروں کے نیچے لٹی ہوئی سنسان ویران پگڈنڈی پر آنے والی گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ اور گھنٹیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اب میری کہانی ختم ہو چکی ہے۔ اب میرے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ جب میں وہاں سے آخری بار لوٹا تو وہ کتبہ جو چچا نے اس کی قبر پر لگایا تھا جو پرانے مویشی خانہ کی شکستہ

دیواروں کے پاس بنی ہوئی تھی۔ اب تک جوں کا توں کھڑا تھا۔

براک بروٹن۔ جیمز بروٹن اور لوٹی کیمرن بروٹن کا بیٹا۔ کتبے پر موٹے موٹے الفاظ لکھے ہوئے تھے تاکہ وہ تمام گھڑ سوار جو یہاں سے گزریں آسانی سے پڑھ لیں۔

مجھے وہ وقت خوب یاد ہے جب میں نے اس کتبے کو پہلی بار دیکھا تھا۔ سالٹ فورک کے لوگوں میں اب تک اس بارے میں کئی رائیں تھیں کہ براک کے ساتھ کیا ہوا تھا اور لوٹی بروٹن کہاں چلی گئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ خود لوٹی بروٹن اپنی زبان سے کسی کو حتیٰ کہ مجھے بھی حقیقی صورت حال نہیں بتائے گی۔ اس خاص دن لوٹی اور سارہ جو ایک ماہ کے لئے میکے آئی ہوئی تھی، کرنل کی بڑی بگھی میں بیٹھ کر شراب خانہ نمبر ۴۴ گئی ہوئی تھیں۔ میرے چچا مویشی خانہ کی گیلری میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں سے انھیں وہ کتبہ نظر آسکتا تھا۔ اس وقت انھوں نے مجھ پر نظریں جماتے ہوئے جو کچھ کہا تھا اس سے ان کے اصل جذبات مجھ پر واضح ہو گئے تھے۔

"ہاں! تم نے دیکھا کہ وہ اب تک کتنی جوان نظر آتی ہے" انھوں نے یہ سوال مجھ سے اپنی کرسی میں اپنے اسی پرانے وقار اور تکبّر کے ساتھ بلٹھتے ہوئے کہا تھا۔ جو میں بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ انھوں نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا :

"ایک خاتون کے لئے یوں چلے جانا واقعی ایک بڑی غلط بات تھی

لیکن ہال وہ ہزاروں میں ایک ہے ۔ اس جیسی کوئی اور کبھی پیدا ہی نہیں ہو گی ۔"

اور ان کا جھریوں بھرا چہرہ شام کے سورج کی طرح گرم اور شاداب ہو گیا ۔ جو کسی اونچے نیچے پڑانے پہاڑ کے مغرب میں ڈھلوان سنگلاخ چٹان کو چھو چھو کر اُسے نرم و ملائم بنا دیتا ہے ۔

باپ نے بیٹے سے جو اصل میں اس کا بیٹا نہیں تھا ، بڑی مشکل سے کہا ''میں تم سے ہمیشہ یہ کہتا رہا ہوں کہ دھوکا دینا حیوانی زندگی کی سب سے ذلیل اور نچلی شکل ہے ۔ خواہ کوئی کچھ بھی بکتا رہے ، میں یہی چاہتا ہوں کہ تم خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر قانونی کاروائیوں سے گزرو اور سب کے سامنے اپنے دامن کا یہ داغ صاف کرو یا سزا بھگتو''

بیٹے نے بڑی سرکش گستاخی سے کہا ''دنیا کا کوئی باپ اپنے بیٹے کو قید خانے نہیں بھیجے گا جبکہ جج نے اسے رہا کر دیا ہے ۔ آپ مجھے اس ویران سنسان مویشی خانے میں مقید نہیں رکھ سکتے ۔ میں اٹھارہ برس کا ہوگیا ہوں ۔ مجھے مویشی چرانے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ۔ میں وہاں رہنا چاہتا ہوں جہاں زندگی ہے ، ہنگامہ ہے ، جہاں انسان بستے ہیں ، جہاں دوکانیں ہیں روشنیاں ہیں ، موسیقی ہے ، رقص ہے اور دنیا بھر کی ساری چیزیں ہیں''

ڈیزائن : سید تفضل ضیا ۔ طباعت : نوروز پریس ۔ لاہور